جلد ۸۳ اگست ۱۹۷۵ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۳	اگست ۱۹۷۵ء مطابق رجب ۱۳۹۵ھ	عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

زر سالانہ بارہ روپے ۔ فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر : محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

علم کا معیار جس طرح مشرقی ممالک میں گرا ہے اسی طرح مغربی ممالک میں بھی اچھا خاصا پست ہوا ہے۔ اس پستی کے یوں تو متعدد وجوہ ہیں مگر ان میں دو خاص طور پر اہم ہیں۔ اہل یورپ کے ذہین و فطین انسان برق و بخارات' میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں اور انسان کی داخلی کیفیات ان کے فہم و ادراک سے اوجھل ہو گئی ہیں دراں حالیکہ اس کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے زیادہ توجہ انسان کے اخلاقی اور روحانی پہلو پر دی جائے۔ مشہور نوبل یافتہ مفکر الیکسیس کیرل نے عہد جدید کے انسان کی اس تنگ نظری اور یک رُخے پن کا اپنی معروف کتاب "انسان نامعلوم" میں دل کھول کر رونا رویا ہے اور اسے دورِ حاضر کے انسان کا سب سے بڑا المیہ قرار دیا ہے۔

علمی معیار کی پستی کی دوسری بڑی وجہ مغربی تہذیب کا انحطاط ہے۔ جب کوئی تہذیب دُنیا میں اُبھرتی ہے تو اس تہذیب کے علمبردار اسے دوسری تہذیبوں پر غالب کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرتے ہیں لیکن اس تہذیب کے غلبے کے بعد جب اس کے ثمرات سے وہ لوگ بہرہ ور ہونا شروع ہوتے ہیں تو ان کے اندر سہل پسندی آجاتی ہے اور وہ قوتِ فکر اور جوشِ عمل دونوں لحاظ سے زوال کی راہ پر چل نکلتے ہیں۔ مگر اس دورِ انحطاط میں بھی کبھی کبھار ایسی کتابیں دیکھنے میں آتی ہیں جو سائنس و صنعیات سے ہٹ کر انسانی مسائل سے بحث کرتی ہیں اور جن میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کا جوہر بھی موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح کی ایک کتاب حال ہی میں "ہم تاریخ سے سبق کیوں حاصل نہیں کرتے؟" لندن سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب حجم کے اعتبار سے اگرچہ مختصر ہے لیکن مباحث کے لحاظ سے بڑی جامع اور فکر انگیز ہے اور فاضل

مصنف نے اس میں اُن حقائق کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو حیات انسانی کے بنیادی حقائق ہیں لیکن جن سے دورِ حاضر کا انسان مسلسل اغماض برت رہا ہے۔ ان صفحات میں اس مرتبہ اس کتاب کے مرکزی موضوع پر چند معروضات پیش کی جائیں گی۔

کتاب کا مصنف نامور فوجی جنرل اور مؤرخ سر بیسیل لڈل ہارٹ ہے جس نے میدانِ جنگ میں اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بنا پر کچھ نتائج اخذ کیے ہیں جن میں بعض غلط بھی ہو سکتے ہیں اور بعض صحیح بھی لیکن اس کے تجزیوں سے یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر سچائی کے لیے طلب صادق بدرجہ اتم موجود ہے۔

حق و صداقت کے بارے میں اس کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ انسان کے دل کی پکار ہونے کی وجہ سے یہ اس کی اپنی ہی بیش قیمت متاع ہے لیکن بعض کمزوریوں کی بنا پر وہ اپنی اس متاع ہی سے ہمیشہ خائف رہا ہے اور اسے من وعن تسلیم کر کے اس کے تقاضے پورے کرنے میں اس نے بخل سے کام لیا ہے۔ یہ اسی جرأت کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ انسان نے اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے بجائے کہ وہ اپنے اندر حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہونے کی ہمت نہیں پاتا اس سے اعراض کے لیے مختلف حیلے بہانے تراش رکھے ہیں جن کی نوعیتیں اگرچہ لاتعداد ہیں مگر بنیادی طور پر انھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ان حیلوں کی پہلی قسم یہ ہے کہ خود حق و صداقت کے بارے ہی میں ذہنوں میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں اور لوگوں کو باور کرایا جائے کہ جس بات کو وہ حق ماننے پر مصر ہیں اس کا حق ہونا ہی محل نظر ہے۔ مثلاً خدا کا وجود کائنات کی ایک ایسی حقیقت ہے جس پر کائنات کا ہر ذرہ گواہ ہے لیکن چونکہ خدا کے اقرار سے انسان پر بعض ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس لیے ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے بچنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ خدا کے وجود کے بارے ہی میں ایسے مباحث اٹھائے جائیں جن سے اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی متنازعہ فیہ مسئلہ بن جائے اور لوگوں کے لیے کھلے یا دبے لفظوں میں اس کے انکار کی گنجائش پیدا ہو یا اگر وہ اپنے آپ کو اس جسارت پر آمادہ نہ کر سکیں تو کم از کم ان کے اندر خدا کے عطا کردہ ضابطوں کے بارے میں بغاوت کا رجحان ابھرنا شروع ہو جائے اور اس کی سب سے

آسان صورت یہ ہے کہ عوام کے دل و دماغ میں یہ باطل خیال راسخ کیا جائے کہ عملی زندگی میں جو کچھ موجود ہے یا جو کچھ ہو رہا ہے یہی اس کے صحیح اور برحق ہونے کی سب سے زیادہ وزنی دلیل ہے۔ حق سے اعراض کا یہ انداز اگرچہ بڑا عام ہے لیکن اگر اس کی تباہ کاریوں اور ستم رانیوں کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس آسمان کے نیچے اس سے زیادہ گمراہ کن اور ہلاکت خیز کوئی دوسرا نظریہ نہیں ہو سکتا۔ اس نظریے کا مقصد یہ ہے کہ جو برائیاں اس وقت دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں ان کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جو جذبات موجزن ہیں وہ ختم ہو جائیں اور انسانی معاشرے میں برائی کے عام چلن کو ہی اس کے اچھائی ہونے کی دلیل سمجھ لیا جائے۔ اس باطل نظریے نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جس طرح گناہوں سے آلودہ کیا ہے اس کا مشاہدہ ہر شخص اپنے گرد و پیش پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے سے بآسانی کر سکتا ہے۔ آپ کسی مرتشی سے یہ کہیں کہ رشوت لینا تو خدا اور خلق دونوں کی نظر میں جرم ہے اور آخرت میں اُسے اس گناہ کی پاداش میں دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا تو وہ بڑی بے تکلفی سے یہ جواب دیتا ہے کونسا شخص اس سے بچا ہُوا ہے۔ جن جن آسامیوں پر رشوت لینے کے مواقع میسّر ہیں وہاں سب اس برائی میں ملوث ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اہلکاروں کی اکثریت رشوت خور ہے لہٰذا صحیح طرزِ عمل رشوت خوری ہی ہے اور جو حقیر سی اقلیت اس برائی سے دامن کش ہے وہ موردِ الزام ہے۔

انفرادی زندگی سے ہٹ کر اجتماعی زندگی پر غور کریں تو آپ کو وہاں بھی یہی باطل فلسفہ ہر شعبۂ حیات میں کارفرما نظر آئے گا مثلاً آپ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو قانون شکنی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور آپ اُن سے کہتے ہیں کہ بھلے آدمیوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی تو وہ اپنے جُرم کے دفاع میں یہ فرماتے ہیں کہ سب لوگ اسی طرح کر رہے ہیں۔ اگر کوئی سیاسی جماعت تختِ اقتدار پر قابض ہونے کے لیے عوام سے جھوٹے وعدے کرے اور پھر اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد وہ ان وعدوں کو پوری ڈھٹائی سے توڑنے لگے اور اسے کہا جائے کہ دیکھیے آپ نے ان وعدوں کے ساتھ قوم سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا تھا لہٰذا اب ان وعدوں کا پاس کیجیے تو دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ ان وعدوں کی تکمیل تو ہو رہی ہے حالانکہ عملاً سب کچھ ان وعدوں کے خلاف کیا جاتا ہے مگر پوری دنیا کے سامنے بغیر کسی احساسِ ندامت کے جھوٹ بولا جاتا ہے اور نجی محفلوں میں جب اپنے کارکن اس وعدہ خلافی پر اضطراب کا اظہار کرتے ہیں تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کیا جاتا ہے کہ حکمرانی اور فرمانروائی کے یہی انداز ہیں یا بالفاظ دیگر کذب و فریب

ہی سے نظامِ مملکت بطریقِ احسن چلایا جا سکتا ہے اور اس کے حق میں وہی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ حکمرانوں کی عظیم اکثریت دجل و فریب کی راہ پر گامزن رہ کر ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکتی ہے۔

"جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ موجود ہے وہی صحیح اور برحق ہے" کے باطل فلسفے نے معاشرت اور سیاست کو ہی تباہ نہیں کیا بلکہ انسانی اخلاق کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اخلاقی بے راہ روی کی مدافعت کے لیے اسی فلسفے کے اسلحہ خانے سے دلائل کے ہتھیار فراہم کیے گئے ہیں۔ یہاں ہم اس اخلاقی انحطاط کی ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ صنفی جبلت ایک فطری داعیہ ہے جس کی تسکین کے لیے خالقِ کائنات نے دو مختلف اصناف کو پیدا کیا ہے تاکہ ذکور و اناث کے باہمی ربط سے اس جبلت کی تسکین کا سامان ہو سکے لیکن چونکہ اس جبلت کے اندر غیر معمولی قوت و طاقت پائی جاتی ہے اس لیے اس بات کا ہر وقت امکان ہو سکتا ہے کہ کہیں یہ داعیہ اپنی فطری حدود سے تجاوز کر کے معاشرے کو تہ و بالا نہ کر دے اس لیے اس کائنات کے مالک نے اس جبلت کو ہی انسان کی پیدائش کا ذریعہ بنایا ہے تاکہ اس کا رخ آزاد شہوت رانی کے بجائے تخلیق و تعمیر کی طرف رہے اور اس طرح یہ قوت اپنی فطری حدود کے اندر رہ کر نسلِ انسانی کے بقا اور خاندانی نظام کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہو۔ پھر اس جبلت کے فطری مقاصد کے حصول کے لیے نکاح کے بندھن معرضِ وجود میں آئے اور ان سے باہر صنفی تعلقات کے قائم کرنے کو گناہ اور جرم قرار دے دیا گیا لیکن جو لوگ صرف جنسی لذت کے دلدادہ تھے اُنہیں ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں قبول کرنا کس طرح گوارا ہو سکتا تھا اس لیے انہوں نے بڑی دلیری کے ساتھ رشتۂ مناکحت کے تقدس کو پامال کیا۔ لیکن اس کھلی ہوئی بے حیائی کے باوجود چونکہ انسان کا اخلاقی احساس اور معاشرے کا اجتماعی ضمیر اس قبیح فعل کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے۔ اس لیے اس جرم کا ارتکاب کرنے والے اپنے اندر کرب محسوس کرتے اور معاشرہ بھی انہیں عزت و احترام کا کوئی مقام دینے پر آمادہ نہ ہوتا۔ لیکن "کسی چیز کے موجود ہونے کی بنیاد پر اس کے برحق ہونے" کے گمراہ کن نظریے نے اس برائی کے بارے میں بھی لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو بدل کر رکھ دیا ہے اور یہ اسی نظریے کا کرشمہ ہے کہ آج آزاد شہوت رانی اور صحبت ہم جنس جیسے گھناؤنے جرائم فطرت کے جائز تقاضے قرار پائے جانے لگے ہیں اور جو لوگ ان کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں اُنہیں انسانیت کا دشمن گردانا جا رہا ہے۔ فطرت کے ان "پرستاروں" کی

قوتِ ادراک اس حد تک مفلوج ہو چکی ہے کہ وہ عمل قومِ لوط کو قانونی جواز فراہم کر چکے ہیں بلکہ اس قانونی جواز کی بنیاد پر دو نوجوانوں کے مابین کلیسا کے اندر مذہبی رسومات کے ہجوم میں رشتہ مناکحت بھی استوار ہو چکا ہے۔ اس خوفناک نوعیت کا اخلاقی انحطاط یکایک نمودار نہیں ہوا بلکہ ایک صدی سے زائد کے غلط افکار و نظریات نے اسے بتدریج جنم دیا ہے اور اس کی تہ میں وہی غلط مفروضہ کارفرما ہے کہ جو کچھ موجود ہے وہی صحیح ہے۔ فرائڈ نے اس مفروضے کی بنیاد پر ہی اپنا سارا فلسفہ مرتب کیا۔ چونکہ صنفی جبلت انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے اس لیے اس کی تسکین ضروری ہے۔ یہاں تک تو بات بالکل درست ہے اور اس سے کسی شخص کو بھی انکار نہیں ہو سکتا لیکن فرائڈ اور اس کے پیرو اس جبلت پر کسی قسم کی پابندی کو انسان کے ذہنی نشوونما کے لیے سم قاتل سمجھتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ چونکہ یہ جبلت ایک حقیقت ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اس کی تسکین کے لیے آزاد ہو اور معاشرہ اس پر اخلاقی پابندیاں عائد کرنے سے گریز کرے۔ معاشرے کے علاوہ خود فرد کو یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ آخر انسان کا وہ داعیہ جو اس کی فطرت میں سمویا ہوا ہے، اس کی تکمیل کی کسی ایسی صورت کو جو اُسے پسند ہو کس طرح گناہ کہا جا سکتا ہے؟ جو جذبہ انسان کی فطری اُمنگ ہے اس کے اظہار پر کسی نوع کی پابندی سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔ اس بنا پر نیکی اور بدی کے دینی تصوّرات بالکل اوہام ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے انسان پر ناروا پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ فطری داعیات کی تسکین کا ہر راستہ خیر اور بھلائی کا راستہ ہے اور اس میں سے کسی راستے کو گناہ کا راستہ قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔ اس سارے فلسفے کی بنیاد وہی نظریہ ہے کہ چونکہ صدیوں سے لوگ اخلاقی حدود کو پھاند کر اپنی جنسی بھوک مٹاتے رہے ہیں اس لیے ان حدود کا قائم کرنا ہی غیر فطری فعل ہے اور صحیح اور معقول روش یہی ہے کہ جن حدود کو لوگ توڑتے رہے ہیں انہیں بالکل مٹا دیا جائے۔

صحبت ہم جنس کو قانونی جواز دینے کے لیے جس وقت انگلستان کے ایوانِ بالا اور ایوانِ زیریں میں بحث ہو رہی تھی اور اس کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل پیش کیے جا رہے تھے اور اخبارات میں یہ جرم موضوعِ بحث بنا ہوا تھا تو اس کی تائید میں ہر پھر کر یہی دلیل پیش کی جاتی رہی کہ اگر یہ گناہ انسانی فطرت کا تقاضا نہیں تو صدیوں سے لوگ اس کا ارتکاب کیوں کر رہے ہیں؟ چونکہ ہر دور میں لوگ اس میں ملوث رہے ہیں اس لیے اسے جرم قرار دینا ہی غلطی ہے۔ اسی منطق کے تحت مغربی مفکرین ہر بُرائی کو بھلائی اور

ہر عیب کو ہنر اور ہر بدی کو نیکی تسلیم کروانے پر مصر ہیں اور اسے اپنا فکری کمال اور انسانیت پر احسانِ عظیم خیال کرتے ہیں۔ فرائڈ کی تعلیمات نے معاشرے پر جو اثرات مرتب کیے ہیں ان سب کو سمیٹ کر اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اخلاق کی دنیا میں اُس کا سب سے بڑا "کارنامہ" یہ ہے کہ اس نے انسان کے دل و دماغ سے گناہ کا تصوّر مٹانے کی کوشش کی ہے اور اسے یہ باور کرایا ہے کہ نیکی اور بدی کے امتیازات محض خیالی باتیں ہیں اور اخلاقی ضابطوں کا وجود بیکار کی زنجیریں ہیں جو انسانیت کی دشمنی میں اسے پہنائی گئی ہیں تاکہ وہ اپنی قوتوں کو صحیح راہ پر لگانے میں ناکام رہے۔

"جو موجود ہے وہی صحیح ہے" کے اصول کے مطابق دورِ جدید میں انسان کی معیشت کو بھی اخلاقی بندھنوں سے آزاد کیا گیا ہے۔ انسان کے ذہن میں شروع ہی سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا احساس ایک لو کی طرح موجود رہا ہے جس کی وجہ سے اس کی باطنی زندگی اخلاقی احساسات سے منور رہی ہے۔ جن لوگوں کو ہوسِ زر نے دلوانہ بنا رکھا تھا وہ بھی اس اخلاقی حس کے تحت حرام کمائی سے کسی نہ کسی صورت دست کش رہتے اور اگر دوزخ کے ایندھن سے پیٹ بھرنا ضروری سمجھتے تو کم از کم اس دھندے کو معاشرے کی نظروں سے چھپایا کرتے۔ اسے انسانیت کی بدقسمتی سمجھیے کہ صنعتی انقلاب کے بعد جب انسان نے سیم و زر کی پرستش شروع کی تو اسے یہ محسوس ہوا کہ حلال و حرام کا امتیاز اس راہ کا سنگِ گراں ہے۔ چنانچہ معیشت دانوں نے اس امتیاز کو مٹانے کے لیے یہ فلسفہ گھڑا کہ حصولِ دولت اور صرفِ دولت حیاتِ انسانی کا ایک ایسا شعبہ ہے جسے اخلاقی گرفت سے یکسر آزاد ہونا چاہیے اور انسانوں کو اس بات کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ وہ دینی معتقدات کو معاشی معاملات میں دخیل نہ ہونے دیں۔ ایک برطانوی مصنّف ٹانی نے اپنی کتاب "مذہب اور سرمایہ داری کا عروج" میں اس فلسفے کے پس منظر پر بڑی مفصل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح معیشت کو اخلاقی ضابطوں سے یکسر آزاد کر کے انسان کو دولت کمانے اور دولت صرف کرنے والا حیوان بنایا گیا ہے۔ یوں تو اس کتاب میں اس موضوع پر مختلف زاویوں سے اور مختلف انداز میں اور فنی دلائل کے ساتھ بحث کی گئی ہے لیکن اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے سارے مباحث میں یہی نظریہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے کہ جب لوگ دولت کی محبت میں فی الحقیقت گرفتار ہو گئے ہیں اور دولت کا حصول ان کی زندگی کا منتہائے مقصود بن چکا ہے

تو اس حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ جو چیز اس مقصد کی راہ میں حائل ہو رہی ہے اُسے مٹا دیا جائے۔ دورِ حاضر کے لوگوں کا دولت کے بارے میں یہ اندازِ جنون ہی اس کے صحیح اور برحق ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ اگر ہوسِ زر انسانی فطرت میں داخل نہ ہوتی یا اس سے مغائرت رکھتی تو انسانوں کی عظیم اکثریت دولت پرستی کا شیوہ کیوں اختیار کرتی؟ اس بنا پر صحیح مسلک دولت پرستی ہی ہے اور جو لوگ اسے غلط قرار دیتے ہیں انہیں لازمی طور پر کوئی نہ کوئی ذہنی عارضہ لاحق ہے۔

"جو کچھ موجود ہے وہی صحیح اور برحق ہے" کا نظریہ چونکہ غلط مفروضات پر قائم ہے اس لیے اس میں قدم قدم پر نہایت واضح تضادات پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ دنیا میں کسی فعل کا وجود ہی اس کے صحیح ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے تو اس دلیل کی بنا پر کسی جسمانی، اخلاقی اور روحانی بیماری کا مداوا فطرت کے خلاف کھلی جنگ ہے کیونکہ انسان شروع ہی سے ان عوارض کا شکار چلا آ رہا ہے۔ جسمانی بیماریوں سے ہر سال ان گنت افراد ہلاک ہوتے ہیں۔ اسی طرح حادثات سے لاکھوں جانیں ضائع ہو جاتی ہیں لیکن آج تک کسی نے اس انداز پر نہیں سوچا کہ ان بیماریوں اور حادثات کی روک تھام کے لیے جدوجہد ترک کر دی جائے کیونکہ یہ بیماریاں اور یہ حادثات ہماری زندگی کے معمولات بن چکے ہیں اور یہ چونکہ موجود ہیں اس لیے ان کا راستہ روکنے کے بجائے انہیں ہلاکت و تباہی لانے کے لیے کھلے مواقع فراہم کرنے چاہییں۔ اگر کسی اخلاقی روگ کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ انسانی فطرت میں داخل ہے اور اس سے نجات دلانے کی کوشش فطرت کے خلاف جنگ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جسمانی عوارض کو بھی فطرت کا تقاضا سمجھتے ہوئے انہیں اپنے مضر اثرات پھیلانے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی احمقانہ بات کرے تو سب اس پر خندہ زن ہوں گے اور اس کو فاتر العقل سمجھتے ہوئے اس کی اس تجویز کو کسی لحاظ سے بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھیں گے لیکن اگر کوئی فرد یہ کہتا ہے کہ اخلاقی عوارض کی روک تھام کے لیے اخلاقی ضابطے عائد کیے جائیں تو اسے احمق اور انسانیت کا دشمن قرار دیا جاتا ہے درآنحالیکہ اخلاقی عوارض جسمانی عوارض سے کہیں زیادہ ہلاکت خیز ہوتے ہیں۔ جسمانی بیماریاں تو چند انسانوں کو موت کی نیند سلا دینے کا باعث بنتی ہیں مگر اخلاقی بیماریاں قوموں اور نسلوں کو برباد کر کے رکھ دیتی ہیں اور جو لوگ ان عوارض کی موجودگی میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں ان کے لیے حیاتِ مستعار کا ہر لمحہ سکراتِ موت سے کسی طرح (باقی اشارات پر ص۲۴)

فصل ششم

عالمگیر اُمتِ مُسلمہ کی تاسیس

دعوتِ اسلامی کا ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ تمام دنیا کے انسان اصل میں ایک، اور آدمی ہونے کی حیثیت سے مساوی ہیں۔ اُن کے درمیان اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے قوموں، نسلوں، قبیلوں، زبانوں، وطنوں اور رنگوں کا جو فرق رکھا ہے وہ محض تعارُف کے لیے ہے تاکہ اُن کے درمیان تعاوُن ہو سکے، نہ اِس لیے کہ اُن کے درمیان اِس سے تفریق رُونما ہو، عداوتیں پڑیں، ایک گروہ دوسرے گروہوں کو ذلیل اور اپنے آپ کو افضل و اشرف سمجھے، اور ایک گروہ دوسروں کو دبانے، لُوٹنے اور مٹا دینے پر تُل جائے۔ اِس بنیادی انسانی مساوات کے دائرے میں اگر کوئی چیز لوگوں کے درمیان جائز اور معقول طور پر وجہِ اجتماع بن سکتی ہے تو وہ صحیح عقیدہ و فکر ہے جس پر وہ جمع ہو کر ایک اُمت بنیں، اور اس اُمت میں بجا طور پر کوئی شے اگر سببِ فضیلت بن سکتی ہے تو وہ تقویٰ ہے، یعنی خدا سے ڈرنا، اُس کی نافرمانی سے بچنا اور آخرت کی باز پرس کو یاد رکھ کر غلط راہوں پر چلنے سے باز رہنا۔

اِس نظریے پر اسلام نے دنیا بھر کے انسانوں میں صرف ایک تفریق کو باقی رکھا، اور وہ مبنی ایمان اور کُفر کی تفریق ہے۔ جو انسان بھی، خواہ وہ کسی ملک، قوم، قبیلے، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ کوئی زبان بولتا ہو، اللہ کی توحید کو اُس طرح مان لے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُسے پیش کیا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو تمام نوعِ انسانی کے لیے اللہ کا آخری رسول اور قرآن کو اللہ کی آخری کتاب تسلیم کر لے، اور آخرت پر یقین لائے، وہ مومن ہے، مومنوں کا بھائی ہے، جماعتِ مومنین کا ایک رکن ہے، اُمتِ مسلمہ کا ایک فرد ہے، اور مسلم معاشرے میں اُس کے حقوق ہر لحاظ سے مساوی ہیں۔ اِس کے برعکس جو شخص بھی، خواہ وہ مومن کا باپ، ماں، بھائی، بہن، بیٹا،

بیٹی، بیوی یا شوہر ہی کیوں نہ ہو اِس عقیدے کو نہ ماننے وہ کافر ہے، ہم قبیلہ یا ہموطن، یا ہمرنگ ہونا تو پھر بھی بعد کا درجہ رکھتا ہے۔ مومن اُس کے ساتھ انسانی تعلق تو باقی رکھے گا، لیکن دوسرے ہر لحاظ سے اس کا معاشرہ مسلم معاشرے سے الگ ہوگا۔ وہ دنیا کے معاملات میں تو اُس کے ساتھ وہ سب روابط رکھ سکتا ہے جو انسانوں کے درمیان فطری طور پہ ہوتے ہیں، مگر دین کے معاملہ میں وہ اس سے دوستی اور محبت نہیں رکھ سکتا، اس کے ساتھ مل کر ایک جماعت اور ایک معاشرہ نہیں بنا سکتا، حتیٰ کہ اس کا باپ بھی اگر کافر تھا تو وہ اس کے لیے دعائے مغفرت تک نہیں کر سکتا۔ دین کے معاملہ میں جنگ کی نوبت آ جائے تو بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے لڑ جائے گا اور اسے کاٹ پھینکنے میں ذرا تأمّل نہ کرے گا، وطن اور قوم دین کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں تو وہ گھر بار اور قوم و وطن سب کو چھوڑ کر ہجرت کر جائے گا مگر اپنے دین کو وطنیت اور قومیت پر ہرگز قربان نہ کرے گا۔

اِس اُمت کا نام ہمیشہ سے "اُمتِ مسلمہ" تھا، ہر نبی کی اُمت مسلم ہی تھی، اور یہی نام اُن لوگوں کا بھی رکھا گیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ اِس کے دروازے عرب و عجم، کالے اور گورے، غرض رُوئے زمین کے ہر شخص کے لیے کھلے تھے، خواہ وہ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، شمال کا باشندہ ہو یا جنوب کا۔ اِس میں کسی قوم کے لیے کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو کسی دوسری قوم کو حاصل نہ ہو۔ اِس کی بنا اتفاقی پیدائش پر نہ تھی بلکہ شعوری ایمان پر تھی۔ اور اِس ایمان میں دنیا بھر کے جو لوگ بھی شریک ہوں وہ بالکل برابر کے حقوق کے ساتھ اِس اُمت میں شریک ہو سکتے تھے۔

پھر یہ اُمت محض مان کر بیٹھ جانے والوں کی اُمت نہ تھی، بلکہ ایک داعی اور مبلّغ اُمت تھی۔ اس کا ہر فرد ایک تحریک کا کارکن تھا جس کا سب سے عزیز تر مقصد یہ تھا کہ جو حق اُسے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کے ذریعہ سے ملا ہے اسے دوسروں تک پہنچائے اور جتنے اللہ کے بندوں کو بھی دنیا میں گمراہی سے اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کر سکتا ہو کرے۔

یہ وہ چیز تھی جس پر صرف قریش ہی نہیں بلکہ عرب کے سارے قبائل تلملا اُٹھے۔ ہزاروں برس سے اُن کا پورا اجتماعی نظام قبائلیت پر مبنی تھا۔ قبیلہ ہی وہ چیز تھی جس سے وابستگی پر اُن کا معاشرہ قائم تھا۔ یہی چیز اُن کی پشت پناہ تھی۔ خونی رشتے ہی اُن کے درمیان ربط و تعلق اور ہمدردی و مددگاری کی بنیاد تھے۔ اِسی پر وہ اپنے شرف اور عزت و کرامت کا مدار رکھتے تھے۔ اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے

پر اپنا سارا فخر و ناز اس بنا پر جتاتا تھا کہ اُس کے آباو اجداد نے فلاں فلاں کارنامے انجام دیے تھے۔ اب جو انہوں نے دیکھا کہ اُن کے درمیان ایک ایسی دعوت اُٹھ رہی ہے جو قبائلیت کی جڑ ہی کاٹے ڈالتی ہے، جو ہر قوم اور قبیلے کے اندر سے آدمی نکال نکال کر اُن کو ایک مستقل جماعت الگ نام سے بنا رہی ہے، جو نہ قوم جانتی ہے نہ قبیلہ، بلکہ ایک عقیدے پر عالمگیر اُخوّت اور رفاقت کی بنیاد رکھ رہی ہے، جو فخر و شرف کے سارے قدیم تصوّرات کا خاتمہ کر کے "رذیل" اور "شریف" سب کو برابر کیے دے رہی ہے، اور کفر و ایمان کے اختلاف کو دوستی و دشمنی کا مدار ٹھیرا کر بیٹے کو باپ سے، بھائی کو بھائی سے، شوہر کو بیوی سے جدا کر رہی ہے، تو اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اِس عظیم معاشرتی انقلاب کو ہضم کرنا اُن کے بس میں نہ رہا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اِس کلی کو ابتدا ہی میں مسل ڈالا جائے تاکہ اس کے کبھی پھول، اور پھول سے باغ بننے کی نوبت ہی نہ آسکے۔ لیکن جن لوگوں کے دماغ میں عقل تھی اور جن کے دل پر تعصبات کے قفل چڑھے ہوئے نہ تھے انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو قبائلی عداوتوں اور نفرتوں کو مٹا کر تمام عرب کو متحد کر سکتا ہے، اور پھر عرب سے گزر کر دنیا بھر کی قوموں کو ایک لڑی میں پرو سکتا ہے۔

دعوتِ اسلامی کے اِس جُز کا مُلخّص جو اُوپر بیان کیا گیا ہے اس کی پوری اہمیت اس وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب قرآن مجید سے اس کی تفصیلات آدمی کے سامنے آجائیں۔

تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں اور اُن میں فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے

اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت جو قرآن مجید میں بیان کی گئی وہ یہ تھی کہ پوری نوعِ انسانی ایک ماں اور باپ کی اولاد ہے اور اِس بنا پر تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ	اے انسانو، ڈرو اپنے اُس رب سے جس نے
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ	تم کو ایک فردِ واحد سے پیدا کیا اور اُسی سے
وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا	اس کا جوڑا بنایا اور اُن دونوں سے بہت
وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا	سے مرد و عورت (دنیا میں) پھیلا دیے۔
وَّنِسَآءً۔ (النساء-۱)	

اس کے بعد دوسری اہم حقیقت جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کی وہ یہ تھی کہ انسانی وحدت کے اندر قوموں اور قبیلوں کی کثرت جو اللہ نے پیدا کی ہے وہ صرف تعارُف کے لیے ہے، اور اُن کے درمیان

فضیلت کا معیار نسل و رنگ اور زبان و وطن نہیں بلکہ تقوٰی کی اخلاقی صفت ہے:

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا - اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ - (الحجرات - ۱۳)	اے انسانو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے (یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنے والا)۔

اس آیت میں پوری نوعِ انسانی کو خطاب کر کے اُس عظیم گمراہی کی نشاندہی کر دی گئی جو دنیا میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے، یعنی نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصّب۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدائش (ACCIDENT OF BIRTH) کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں اِن کی بنا ایک خاندان، قبیلے، یا نسل میں پیدا ہو جانا ہے، اور کہیں ایک جغرافی خطّے میں، یا ایک خاص رنگ والی، یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہونا۔ پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے وہ صرف اِس حد تک محدود نہیں رہی ہے کہ جنہیں اِس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو اُن کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبّت اور زیادہ تعاوُن ہو، بلکہ اِس تمیز نے نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بد ترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اِس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں۔ مذاہب ایجاد کیے گئے ہیں۔ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اخلاقی اصول وضع کیے گئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں نے اِس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اِسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق بلکہ ابناء اللہ ٹھیرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں وَرن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا جس کی رُو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھیرائے گئے، اور شُودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ

کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، آج اِس بیسویں صدی ہی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے اُنہیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھُس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا، اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کرکے جو برتاؤ اُن کے ساتھ کیا، اُس کی تہ میں بھی یہی تصوّر کارفرما کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حدُود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو اُن پر مُباح ہے اور اُنہیں حق پہنچتا ہے کہ اُن کو لُوٹیں، غلام بنائیں، اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے اس کی بدترین مثالیں زمانۂ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور آج دیکھی جا رہی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصوّر پچھلی جنگ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کُن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

اِس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مُخاطَب کرکے تین نہایت اہم اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ تم سب کی اصل ایک ہے، ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے، اور آج تمہاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔ اِس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اُس تفرقے اور اُونچ نیچ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے جس کے زعمِ باطل میں تم مبتلا ہو۔ ایک ہی خدا تمہارا خالق ہے، ایسا نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف خداؤں نے پیدا کیا ہو۔ ایک ہی مادّہ تخلیق سے تم بنے ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ انسان کسی پاک یا بڑھیا مادّے سے بنے ہوں اور کچھ دوسرے انسان کسی ناپاک یا گھٹیا مادّے سے بن گئے ہوں۔ ایک ہی ماں باپ کی تم اولاد ہو، یہ بھی نہیں ہے کہ ابتدائی انسانی جوڑے بہت سے رہے ہوں جن سے دنیا کے مختلف خِطّوں کی آبادیاں الگ الگ پیدا ہوئی ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ پُوری رُوئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان تو نہیں ہو سکتا تھا۔ نسل بڑھنے کے ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں اور پھر خاندانوں سے قبائل اور اقوام وجود

میں آجائیں ۔ اسی طرح زمین کے مختلف خطّوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ ، خدوخال ، زبانیں اور طرزِ بود و ماند بھی لامحالہ مختلف ہی ہوجانے تھے، اور ایک خطّے کے رہنے والوں کو باہم قریب تر اور دُور دراز خطّوں کے رہنے والوں کو بعید تر ہی ہونا تھا۔ مگر اِس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اِس کی بنیاد پر اُونچ اور نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کیے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل و حقیر جانیں، ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوّق جمائے، اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح حاصل ہو۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتب کیا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اُن کے درمیان باہمی تعارف اور تعاون کی فطری صورت یہی تھی۔ اِسی طریقے سے ایک خاندان، ایک برادری، ایک قبیلے اور ایک قوم کے لوگ مل کر مشترک معاشرت بنا سکتے تھے، اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے مددگار بن سکتے تھے۔ مگر یہ محض شیطانی جہالت تھی کہ جس چیز کو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے تعارُف کا ذریعہ بنایا تھا اُسے تفاخُر اور تنافُر کا ذریعہ بنا لیا گیا اور پھر نوبت ظلم و عُدوان تک پہنچا دی گئی۔

تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں، کیونکہ اُن کا پیدا کرنے والا ایک ہے، ان کا مادّۂ پیدائش اور طریقِ پیدائش ایک ہی ہے، اور ان سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے۔ علاوہ بریں کسی شخص کا کسی خاص ملک، قوم، یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے جس میں اُس کے اپنے اِرادہ و انتخاب اور اس کی اپنی سعی و کوشش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اِس لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا، بُرائیوں سے بچنے والا، اور نیکی و پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنی ذاتی خوبی کی بنا پر قابلِ قدر ہے۔ اور جس کا حال اِس کے برعکس ہو وہ بہرحال ایک کمتر درجے کا انسان ہے چاہے وہ کالا ہو یا گورا، مشرق میں پیدا ہو یا مغرب میں۔

یہی حقائق جو قرآن کی ایک مختصر سی آیت میں بیان کیے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ان کو اپنے مختلف خطبات اور ارشادات میں زیادہ کھول کر بیان فرمایا ہے۔ فتحِ مکہ کے موقع پر طوافِ کعبہ کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں فرمایا:

اَلحمدُ لِلّٰہِ الَّذِی اَذھب عنکم عَیبَۃَ الجاھلیۃ وتکبُّرَھا۔ یٰاَیھا الناس الناسُ رَجُلان، بَرٌّ تقی کریم علی اللّٰہِ، وفاجر شقی ھَیِّنٌ علی اللّٰہ۔ الناسُ کلھم بنو اٰدم وخلق اللّٰہ اٰدم من تُراب۔ (بَیہقی فی شعب الایمان۔ ترمذی)

شکر ہے اُس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبّر دور کر دیا۔ لوگو، تمام انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار، جو اللہ کی نگاہ میں عزّت والا ہے۔ دوسرا فاجر اور شقی، جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔

حَجّۃ الوَداع کے موقع پر ایّامِ تشریق کے وسط میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس میں فرمایا:

یٰاَیھا النّاس۔ اَلا اِنّ ربکم واحدٌ لا فضل لعربي علی عجمی ولا لعجمی علیٰ عربي ولا لِاسود علیٰ احمر ولا لِاحمر علی اسود الّا بالتقویٰ، ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقٰکم۔ اَلا ھل بلَّغتُ۔ قالوا بلیٰ یا رسول اللّٰہ۔ قال فَلْیبلّغ الشاھدُ الغائبَ (بَیہقی)

لوگو، خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزّت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ، میں نے تمہیں بات پہنچا دی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ فرمایا، اچھا تو جو موجود ہے وہ اُن لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:

کُلُّکُم بنو اٰدم واٰدم خُلِقَ

تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی

من تراب - ولينتهين قوم يفخرون باباءهم او ليكونن اهون على الله من الجعلان (بزار)	سے پیدا کیے گئے تھے - لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں حقیر کیڑوں سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

ان الله لا يسئلكم عن احسابكم ولا عن انسابكم يوم القيامة، ان اكرمكم عند الله اتقكم (ابن جریر)	اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گا - اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان الله لا ينظر الى صوركم واموالكم ولكن ينظر الى قلوبكم واعمالكم۔ (مسلم - ابن ماجہ)	اللہ تمہاری صورتیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔

یہ تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہلِ ایمان کی ایک عالمگیر برادری عملاً قائم کرکے دکھا دی جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں جس میں اُونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق و تعصّب کا کوئی تصور نہیں، جس میں شریک ہونے والے تمام انسان، خواہ وہ کسی نسل و قوم اور ملک و وطن سے تعلّق رکھتے ہوں، بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مساوات اور وحدت کے اصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے اس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی دین اور کسی نظام میں نہیں پائی جاتی، نہ کبھی پائی گئی ہے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے روئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک عقیدے کی بنا پر ایک اُمّت بنا دیا ہے۔

یہی ابدی قاعدہ آخرت میں بھی جاری ہوگا | اس سے آگے بڑھ کر قرآن نے لوگوں کو اس حقیقت سے باخبر

کیا کہ نسل و قوم و وطن کے بجائے عقیدہ و عمل کی بنیاد پر اختلاف اور اجتماع کا یہی قاعدہ موجودہ دنیا کے ختم ہونے کے بعد آخرت کی دوسری زندگی میں بھی اسی طرح جاری ہوگا، اور دوسری بنیادوں پر یہاں جو جتھہ بندیاں قائم ہیں وہ سب تتر بتر ہو جائیں گی:

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ (الروم-۱۴) جس روز قیامت برپا ہوگی سب انسان اُس روز الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے۔

یعنی دنیا کی وہ تمام جتھہ بندیاں جو آج قوم، نسل، وطن، زبان، قبیلہ و برادری اور معاشی و سیاسی مفادات کی بنیاد پر بنی ہوئی ہیں، اُس روز ٹوٹ جائیں گی، اور خالص عقیدے اور اخلاق و کردار کی بنیاد پر نئے سرے سے ایک دوسری گروہ بندی ہوگی۔ ایک طرف نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی قوموں میں سے مومن و صالح انسان الگ چھانٹ لیے جائیں گے اور ان سب کا ایک گروہ ہوگا۔ دوسری طرف ایک ایک قسم کے گمراہانہ نظریات و عقائد رکھنے والے اور ایک ایک قسم کے بدعمل اور جرائم پیشہ لوگ اُس عظیم الشان انسانی بھیڑ میں سے چھانٹ چھانٹ کر الگ نکال لیے جائیں گے اور ان کے الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام جس چیز کو اس دنیا میں تفریق اور اجتماع کی حقیقی بنیاد قرار دیتا ہے اور جسے جاہلیت کے پرستار یہاں ماننے سے انکار کرتے ہیں، آخرت میں اُسی بنیاد پر تفریق بھی ہوگی اور اجتماع بھی۔ اسلام کہتا ہے کہ انسانوں کو کاٹنے اور جوڑنے والی اصل چیز عقیدہ و اخلاق ہے۔ ایمان لانے والے اور خدا کی ہدایت پر نظامِ زندگی کی بنیاد رکھنے والے ایک اُمت ہیں، خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور کفر و فسق کی راہ اختیار کرنے والے ایک دوسری اُمت ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی نسل و وطن سے ہو۔ ان دونوں کی قومیت ایک نہیں ہوسکتی۔ یہ نہ دنیا میں ایک مشترک راہِ زندگی بنا کر ایک ساتھ چل سکتے ہیں اور نہ آخرت میں ان کا انجام ایک ہوسکتا ہے۔ دنیا سے آخرت تک اِن کی راہ اور منزل ایک دوسرے سے الگ ہے۔ جاہلیت کے پرستار اِس کے برعکس ہر زمانے میں اصرار کرتے رہے ہیں۔ اور آج بھی اس بات پر مُصر ہیں کہ جتھہ بندی نسل و وطن اور زبان کی بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ اِن بنیادوں کے لحاظ سے جو لوگ مشترک ہوں اُنھیں بلالحاظ مذہب و عقیدہ ایک قوم بن کر دوسری ایسی ہی قوموں کے مقابلے میں متحد ہونا چاہیے، اور اِس قومیت کا ایک ایسا نظامِ زندگی ہونا چاہیے جس میں توحید اور شرک اور دہریت

کے معتقدین سب ایک ساتھ مل کر چل سکیں - یہی تخیّل ابوجہل اور ابولہب اور سرداران قریش کا تھا جب وہ بار بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ اس شخص نے آکر ہماری قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ اسی پر قرآن مجید یہاں متنبہ کر رہا ہے کہ تمہاری یہ تمام جتھہ بندیاں جو تم نے اس دنیا میں غلط بنیادوں پر کر رکھی ہیں آخر کار ٹوٹ جانے والی ہیں - نوعِ انسانی میں مستقل تفریق اسی عقیدے اور نظریۂ حیات اور اخلاق و کردار کی بنیاد پر ہونے والی ہے جس پر اسلام دنیا کی اِس زندگی میں کرنا چاہتا ہے - جن لوگوں کی منزل ایک نہیں ہے اُن کی راہِ زندگی آخر کیسے ایک ہوسکتی ہے -

اُمتِ مسلمہ جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا، تمام انسانوں کو ایک قرار دینے کے بعد اسلام ان کے درمیان صرف تقویٰ کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے، اور اسلام کے نقطۂ نظر سے تقویٰ کا مطلب ہے اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کے بیان کردہ عقائد و احکام کو ماننا، اور آخرت کی باز پرس کو ملحوظ رکھتے ہوئے نافرمانی کی روش چھوڑ کر فرمانبرداری کی روش اختیار کر لینا - اس لیے اسلام تمام نوعِ انسانی کو صرف دو حصوں پر تقسیم کرتا ہے - ایک وہ جو ایمان لائے، اور دوسرا وہ جو ایمان نہ لائے - ایمان لانے والوں کو وہ ایک اُمت بناتا ہے اور اس کا نام اُمتِ مُسلِمہ رکھتا ہے جس میں دنیا کا ہر مومن شریک ہوسکتا ہے - اور یہ کوئی نیا نام نہیں ہے جو صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اُوپر ایمان لانے والوں کے لیے رکھا ہو، بلکہ قدیم ترین زمانے سے تمام انبیاء کی اُمتوں کا اللہ تعالیٰ نے یہی نام رکھا ہے :

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا - (الحج - ۷۸)

اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اِس (قرآن) میں بھی -

" تمہارا " کا خطاب مخصوص طور پر صرف اُنہی اہل ایمان کی طرف نہیں ہے جو اِس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے، یا اِس کے بعد اہل ایمان کی صف میں داخل ہوئے - بلکہ اس کے مخاطب تمام وہ لوگ ہیں جو آغازِ تاریخِ انسانی سے توحید، آخرت، رسالت اور کتبِ الٰہی کے ماننے والے رہے ہیں - مدعا یہ ہے کہ اِس ملّتِ حق کے ماننے والے ہمیشہ پہلے بھی " نوحی " " ابراہیمی " ، " موسوی " ، " مسیحی " وغیرہ نہیں کہلاتے تھے بلکہ اُن کا نام " مُسلم " (اللہ کے تابعِ فرمان) تھا - اور آج بھی وہ " محمدی " نہیں بلکہ " مسلم " ہیں - اِس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کے لیے یہ سوال معمّا بن گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کا نام قرآن سے پہلے " مسلم " کس کتاب میں رکھا گیا تھا - (ضروری نہیں کہ ہر زبان میں یہی عربی لفظ " مسلم " استعمال ہوا ہو-

لیکن انبیاء کے ماننے والوں کا جو نام بھی کسی زبان میں رکھا گیا وہ مسلم ہی کا ہم معنی تھا)۔

اُمت مسلمہ کی عالمگیری اور ازلیت و ابدیت

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۔ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۔

(القصص۔ ۵۲-۵۳)۔

جن لوگوں کو اِس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اِس (قرآن) پر ایمان لا رہے ہیں۔ اور جب یہ انہیں سُنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم اس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے سے مُسلم ہیں"۔

یعنی اس سے پہلے بھی ہم انبیاء اور کتب آسمانی کے ماننے والے تھے، اِس لیے اسلام کے سوا ہمارا کوئی اور دین نہ تھا۔ اور اب جو نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب لے کر آیا ہے اسے بھی ہم نے مان لیا ہے، لہذا درحقیقت ہمارے دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، بلکہ جیسے ہم پہلے مسلمان تھے ویسے ہی اب بھی مسلمان ہیں۔

ایمان لانے والے اہل کتاب کا یہ قول جسے قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے، اِس بات کی صاف صراحت کر دیتا ہے کہ اسلام صرف اُس دین کا نام نہیں ہے جسے محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم لے کر آئے ہیں اور "مسلم" کی اصطلاح کا اطلاق محض حضور کے پیروؤں تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے تمام انبیاء کا دین یہی اسلام تھا اور ہر زمانہ میں اُن سب کے پیرو مسلمان ہی تھے۔ یہ مسلمان اگر کبھی کافر ہوئے تو صرف اُس وقت جب کہ کسی بعد کے آنے والے نبیِ صادق کو ماننے سے اُنھوں نے انکار کر دیا۔ لیکن جو لوگ پہلے نبی کو مانتے تھے اور بعد کے آنے والے نبی پر بھی ایمان لے آئے ان کے اسلام میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوا۔ وہ جیسے مسلمان پہلے تھے ویسے ہی بعد میں رہے۔

تعجب ہے کہ بعض بڑے بڑے اہلِ علم بھی اس حقیقت کے ادراک سے عاجز رہ گئے ہیں، حتیٰ کہ اِس صریح آیت کو دیکھ کر بھی اُن کا اطمینان نہ ہوا۔ علامہ سیوطی نے ایک مفصل رسالہ اس موضوع پر لکھا ہے کہ مُسلم کی اصطلاح صرف اُمت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے مُختص ہے۔ پھر جب یہ آیت اُن کے سامنے آئی تو خود فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ میں نے پھر خدا سے دُعا کی کہ اِس

معاملہ میں مجھے شرحِ صدر عطا کر دے۔ آخر کار اپنی رائے سے رجوع کرنے کے بجائے انھوں نے اُس پر اصرار کیا اور اس آیت کی متعدد تاویلیں کر ڈالیں جو ایک سے ایک بڑھ کر بے وزن ہیں۔ مثلاً اُن کی ایک تاویل یہ ہے کہ اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ کے معنی ہیں ہم قرآن کے آنے سے پہلے ہی مُسلم بن جانے کا عزم رکھتے تھے، کیونکہ ہمیں اپنی کتابوں سے اس کے آنے کی خبر مل چکی تھی اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ آئے گا تو ہم اسلام قبول کر لیں گے۔ اُن کی دوسری تاویل یہ ہے کہ اِس فقرے میں مسلمین کے بعد لفظ بِهٖ محذوف ہے، یعنی پہلے ہی سے ہم قرآن کو مانتے تھے، کیونکہ اُس کے آنے کی ہم توقع رکھتے تھے اور اس پر پیشگی ایمان لائے ہوئے تھے، اس لیے تورات و انجیل کو ماننے کی بنا پر نہیں بلکہ قرآن کو اُس کے نزول سے پہلے برحق مان لینے کی بنا پر ہم مسلم تھے۔ تیسری تاویل اُن کی یہ ہے کہ تقدیرِ الٰہی میں ہمارے لیے پہلے ہی مقدّر ہو چکا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی آمد پر ہم اسلام قبول کر لیں گے، اس لیے درحقیقت ہم پہلے ہی سے مسلم تھے۔ ان تاویلوں میں سے کسی کو دیکھ کر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اللہ کے عطا کردہ شرحِ صدر کا اُس میں کوئی اثر موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن صرف اسی ایک مقام پر نہیں بلکہ بیسیوں مقامات پر اس اصولی حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اصل دین صرف "اسلام" (اللہ کی فرمانبرداری) ہے، اور خدا کی کائنات میں خدا کے بندوں کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا دین ہو نہیں سکتا، اور آغازِ آفرینش سے جو نبی بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے وہ یہی دین لے کر آیا ہے، اور انبیاء علیہم السلام ہمیشہ خود مسلم رہے ہیں، اپنے پیروؤں کو انھوں نے مسلم ہی بن کر رہنے کی تاکید کی ہے، اور اُن کے وہ سب مُتَّبِعین جنھوں نے نبوت کے ذریعے سے آئے ہوئے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا، ہر زمانے میں مُسلم ہی تھے۔

اس سلسلے میں مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران - آیت ۹)	درحقیقت اللہ کے نزدیک دین تو اسلام ہی ہے۔
وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ (آل عمران - آیت ۸۵)	اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۔

(یونس ۔ ۷۲)

میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلموں میں شامل ہو کر رہوں ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ۔ وَوَصّٰى بِهَا إِبْرٰهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ، يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۔ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي ۔ قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۔

(البقرہ ۔ ۱۳۱ تا ۱۳۳)

جب اُس کے رب نے اُس سے کہا کہ "مسلم (تابع فرمان) ہو جا"، تو اُس نے کہا "میں رب العالمین کا مسلم ہو گیا" اور اِسی چیز کی وصیت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی اور یعقوبؑ نے بھی، کہ "اے میرے بچو، اللہ نے تمہارے لیے اِس دین کو پسند کیا ہے لہٰذا تم کو موت نہ آئے مگر اِس حال میں کہ تم مسلم ہو" (اے یہودیو) کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آیا؟ جب کہ اُس نے اپنی اولاد سے پوچھا "کس کی بندگی کرو گے تم میرے بعد؟" انہوں نے جواب دیا "ہم بندگی کریں گے آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی، اُس کو اکیلا معبود مان کر، اور ہم اُسی کے مسلم ہیں"۔

مَا كَانَ إِبْرٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا ۔ (آل عمران ۔ ۶۷)

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی ۔ بلکہ وہ یکسو مسلم تھا ۔

حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خود دعا مانگتے ہیں:۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۔ (البقرہ ۔ ۱۲۸)	اے ہمارے رب، ہم کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک امت پیدا کر جو تیری مسلم ہو۔

حضرت لوطؑ کے قصے میں ارشاد ہوتا ہے۔

فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ۔ (الذاریات ۔ ۳۶)	ہم نے قوم لوط کی بستی میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا (یعنی خود حضرت لوطؑ کا گھر)۔

حضرت یوسفؑ بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہیں۔

تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ ۔ (یوسف ۔ ۱۰۱)	مجھ کو مسلم ہونے کی حالت میں موت دے اور مجھے صالحوں کے ساتھ ملا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:۔

يٰقَوْمِ إِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا إِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِينَ ۔ (یونس ۔ ۸۴)	اے میری قوم کے لوگو، اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اُسی پر بھروسہ کرو اگر تم مسلم ہو ۔

بنی اسرائیل کا اصل مذہب یہودیت نہیں بلکہ اسلام تھا، اس بات کو دوست اور دشمن سب جانتے تھے ۔ چنانچہ فرعون سمندر میں ڈوبتے وقت آخری کلمہ جو کہتا ہے وہ یہ ہے:۔

اٰمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا الَّذِي اٰمَنَتْ بِهِ بَنُوْا إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ (یونس ۔ ۹۰)	میں مان گیا کہ کوئی معبود اُس کے سوا نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلموں میں سے ہوں۔

تمام انبیاء بنی اسرائیل کا دین بھی یہی اسلام تھا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۔ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِينَ أَسْلَمُوْا لِلَّذِينَ	ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی ۔ اُسی کے مطابق وہ نبی جو مسلم تھے اُن لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے

هَادُوْا (المائدہ - ۴۴) تھے جو یہودی بن گئے تھے۔

یہی حضرت سلیمان علیہ السّلام کا دین تھا، چنانچہ ملکۂ سبا اُن پر ایمان لاتے ہوئے کہتی ہے:۔

اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (النمل - ۴۴) میں سلیمان کے ساتھ رب العالمین کی مسلم ہو گئی۔

اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور اُن کے حواریوں کا دین تھا۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ اور جبکہ میں نے حواریوں پر وحی کی کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کر ہم مسلم ہیں۔

(المائدہ - ۱۱۱)

اس معاملہ میں اگر کوئی شک اس بنا پر کیا جائے کہ عربی زبان کے الفاظ "اسلام" اور "مسلم" اِن مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں کیسے مستعمل ہو سکتے تھے، تو ظاہر ہے کہ یہ محض ایک نادانی کی بات ہوگی۔ کیونکہ اصل اعتبار عربی کے اِن الفاظ کا نہیں بلکہ اس معنی کا ہے جس کے لیے یہ الفاظ عربی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ دراصل جو بات اِن آیات میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حقیقی دین مسیحیت یا موسویت یا محمدیت نہیں ہے بلکہ انبیاء اور کتبِ آسمانی کے ذریعہ سے آئے ہوئے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہے، اور یہ رویّہ جہاں جس بندۂ خدا نے بھی جس زمانے میں اختیار کیا ہے وہ ایک ہی عالمگیر ازلی و ابدی دینِ حق کا متّبع ہے۔ اس دین کو جن لوگوں نے ٹھیک ٹھیک شعور اور اخلاص کے ساتھ اختیار کیا ہے اُن کے لیے موسیٰ کے بعد مسیح کو اور مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کو ماننا تبدیلِ مذہب نہیں بلکہ حقیقی دین کے اتباع کا فطری و منطقی تقاضا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ انبیاء علیہم السّلام کے گروہوں میں بے سوچے سمجھے گھس آئے یا پیدا ہو گئے اور قومی و نسلی اور گروہی تعصبات نے جن کے لیے اصل مذہب کی حیثیت اختیار کر لی، وہ بس یہودی یا مسیحی بن کر رہ گئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر اُن کی جہالت کی قلعی کھل گئی۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے آخری نبی کا انکار کر کے نہ صرف یہ کہ آئندہ کے لیے مسلم رہنا قبول نہ کیا بلکہ اپنی اس حرکت سے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقت میں وہ پہلے بھی "مسلم" نہ تھے محض ایک نبی یا بعض انبیاء کی شخصی گرویدگی میں مبتلا تھے، یا آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کو دین بنائے بیٹھے تھے۔ (باقی)

مصری عدلیہ کا ایک اہم فیصلہ

جناب خلیل حامدی صاحب

استاذ علی جریشہ مصر کی کونسل آف سٹیٹ کا رکن تھا - یہ کونسل ایک اعلیٰ عدالتی ادارہ ہے جو سرکاری ملازمین کے خلاف شکایات کی سماعت کرتا ہے اس کے ججوں کو وہی حقوق و مراعات حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے اعلیٰ عدالتی اداروں کو حاصل ہیں - ۲۴ راگست ۱۹۶۵ء کو جمال عبد الناصر کے عہد میں علی جریشہ کو عین اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ ایک سرکاری غبن کے سلسلے میں تحقیقات پر مامور تھا - اور چونکہ تحقیقاتی کارروائی سے ثابت ہو رہا تھا کہ اس غبن میں حکمران گروہ کے متعدد افراد بھی ملوّث ہیں اس لیے استاذ جریشہ کے عدالتی وقار اور قانونی تحفظ کا لحاظ کیے بغیر ان کو گرفتار کر کے فوجی جیل میں ڈال دیا گیا، جہاں انہیں غیر معمولی اذیت دی گئی - فوجی افسران کو جب یہ معلوم ہوا کہ کونسل آف سٹیٹ کا جج ہونے کی حیثیت سے علی جریشہ کے ساتھ جو کچھ معاملہ کیا گیا ہے وہ ایک خطرناک اقدام ہے تو انہوں نے علی جریشہ سے زبردستی استعفےٰ دلوایا اور پھر انہیں "فوجی عدالت" میں پیش کر کے بارہ سال قید بامشقت کی سزا دلوائی۔

انور السادات کے دَور میں جہاں دوسرے بے گناہ قیدی رہا کیے گئے ہیں اُن میں علی جریشہ بھی ۹ سال کی قید بامشقت بھگتنے کے بعد رہا ہوئے ہیں - ۳۰ مارچ ۱۹۷۵ء کو علی جریشہ نے قاہرہ کی عدالت میں مصر کے وزیرِ جنگ کے خلاف یہ مقدمہ دائر کر دیا کہ "اُسے غیر قانونی طور پر گرفتار کیا گیا تھا حالانکہ وہ کونسل آف سٹیٹ کا جج تھا - گرفتاری کے وقت وہ تمام عدالتی تحفظات جو اُسے حاصل تھے پامال کیے گئے - اور باوجود اس بات کے کہ وہ سول آبادی سے تعلق رکھتا تھا اُسے فوجی جیل میں محبوس کیا گیا - اس جیل کے اندر اُسے طرح طرح کا عذاب دیا گیا - اور اذیت رسانی کے خوفناک آلات اس پر استعمال کیے گئے - پھر تعذیب و تشدد کی

فضا میں ملٹری پولیس کی طرف سے اس کے خلاف تحقیقات کا آغاز ہوا - اور اسی خوف و دہشت کی فضا میں اُسے بتایا گیا کہ چونکہ اُسے انقلابی کونسل کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے لہذا اُسے اپنے منصب سے استعفیٰ دے دینا چاہیے - چنانچہ مجبوراً اُس نے حکم کی تعمیل کی اور جبری استعفیٰ دے دیا - پھر سپریم سیکورٹی کورٹ آف اسٹیٹ میں اُس پر مقدمہ چلایا گیا جہاں سے اُسے بارہ سال قید بامشقت کی سزا سُنائی گئی - اُس نے جیل میں جو جسمانی اور ذہنی مصائب برداشت کیے ہیں اور گرفتار ہو جانے کے بعد جو مالی نقصانات اُٹھائے ہیں اُن کی تلافی گو اب مادی تخمینوں سے نہیں کی جا سکتی مگر تاہم وہ وزیرِ جنگ اور اُس کے ماتحت کارکنوں سے تیس ہزار پاونڈ علاوہ مصارف مقدمہ اور معاوضہ وکیل بطور ہرجانہ کا مطالبہ کرتا ہے" علی جریشہ نے اس درخواست کے ساتھ طبی معائنے کی رپورٹ اور چند تصویریں بھی پیش کیں جو اس بات کا واضح ثبوت تھیں کہ اُسے جسمانی طور پر شدید عذاب دیا گیا ہے - اور اُس عذاب کے نشانات جسم کے مختلف حصوں میں صاف نظر آ رہے ہیں۔

۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو عدالت میں مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی - اس مقدمے کے دو حصے تھے ایک بنیادی مقدمہ جو مدّعی کی طرف سے موجودہ وزیرِ جنگ کے خلاف دائر کیا گیا تھا - اور دوسرا ضمنی مقدمہ جو موجودہ وزیرِ جنگ کی طرف سے سابق وزیرِ جنگ شمس بدران اور اُس کے ماتحت ملازمین جنرل حمزہ بسیونی کمانڈر فوجی جیل کے ورثاء سعد زغلول ڈائرکٹر ملٹری پولیس کے ورثاء حسن خلیل ڈائرکٹر ملٹری انٹیلی جنس، میجر حسن کفافی اور لیفٹیننٹ محمد صفوت الروبی کے خلاف دائر کیا گیا - سماعت کرنے والا بنچ تین ججوں پر مشتمل تھا - ایک خود چیف جسٹس محمود عبدالحافظ ہربدی اور دو جج محمود منصور اور احمد سعد عابد تھے - مدّعی کی طرف سے چھ گواہ پیش کیے گئے ذیل میں گواہوں کے بیانات اور عدالت کا فیصلہ درج کیا جاتا ہے:

پہلا گواہ: سابق نائب وزیر اعظم "مسٹر کمال رمزی اسٹینو نے شہادت کے دوران بتایا کہ میں ۱۹۶۴ء میں نائب وزیر اعظم برائے خوراک اور داخلی تجارت تھا - وزارت خوراک کے بعض ملازمین اور سرکاری شعبے کے چند ملازمین کے خلاف غبن کی شکایات موصول ہوئیں - چنانچہ میں نے اس وقت کے وزیر اعظم علی صبری سے مل کر یہ طے کیا کہ عدالت کے ایک جج کی سرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو ان شکایات کی تحقیقات کرے، اور جس ملازم کے بارے میں غبن کا الزام درست ثابت ہو جائے، یا اس کی کوتاہی واضح ہو جائے،

اُس کے لیے مناسب سزا تجویز کرے۔ چنانچہ مدّعی (جج علی جریشہ) کا نام اس کمیٹی کی سربراہی کے لیے تجویز کیا گیا اور علی جریشہ نے بالفعل تحقیقات کا آغاز کر دیا۔ ایک روز علی جریشہ نے مجھے بتایا کہ ملٹری پولیس کے کچھ افسران اُس کے پاس آئے اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اب تک جو تحقیقات ہو چکی ہیں وہ انہیں بتائی جائیں۔ نیز انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ کیا وہ (یعنی علی جریشہ چیئرمین کمیٹی) کمیٹی کے فیصلوں کے اندر کچھ ہیرا پھیری کر سکتے ہیں؟ اس پر انہوں نے تحقیقاتی رپورٹ کے اندراجات سے تو ملٹری پولیس کے افسران کو آگاہ کر دیا، لیکن کمیٹی کی کارروائی کے اندر کچھ ردّ و بدل کرنے سے انکار کر دیا۔ "علی جریشہ کمیٹی" کی رپورٹ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں، اور فوجی حکّام اس میں ہر صورت دخل اندازی کرنا چاہتے تھے، اور علی جریشہ پر جائز و ناجائز ہر طریقے سے ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک روز شام کو ملٹری پولیس کے سپاہی یکایک انکوائری کورٹ کے کمرے میں آ گھسے۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ توڑ دیا اور جتنا تحقیقاتی ریکارڈ اندر پڑا تھا اُٹھا کر لے گئے۔ اس واقعہ کے تین روز بعد علی جریشہ کی بیوی میرے دفتر میں آئی اور اس نے مجھے بتایا کہ اُس کے خاوند کو گرفتار کر لیا گیا ہے، اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ گرفتاری میرے تفویض کردہ کام کی وجہ سے عمل میں آئی ہے، اور چونکہ اُس نے تحقیقات کے اندر ہیرا پھیری کرنے سے انکار کر دیا ہے اس لیے وہ نشانۂ عتاب بن گیا ہے۔ چنانچہ میں اسی وقت وزیرِ انصاف سے ملا، اُسے ساری داستان سنائی اور بتایا کہ علی جریشہ کو گرفتار کر لیا گیا ہے حالانکہ وہ عدلیہ کا ایک رُکن ہے۔ وزیرِ انصاف یہ سن کر کہنے لگا کہ اُسے اِس قضیے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اور اس امر پر اُس نے اظہارِ تعجب کیا کہ اُسے بتائے بغیر عدالت کے ایک جج کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وزیرِ انصاف نے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں حقیقتِ حال کی ٹوہ لگائے گا۔ میں دوبارہ وزیرِ انصاف سے ملا۔ وزیرِ انصاف نے بتایا کہ علی جریشہ کی گرفتاری وزارتِ خوراک کے غبن کے مسئلہ پر نہیں ہوئی ہے بلکہ اس لیے اُسے گرفتار کیا گیا ہے کہ اُس کا تعلق الاخوان المسلمون سے ہے"۔

گواہ مسٹر کمال رمزی استینو نے اپنا یہ تاثر بیان کیا کہ مدّعی (یعنی علی جریشہ) پر جو الزام عاید کیا گیا تھا (کہ اس کا تعلق اخوان سے ہے) یہ قطعاً نامناسب تھا۔ علی جریشہ غیر جانب دار آدمی تھا۔ ملٹری پولیس کے افسران اور مصری انٹیلی جنس نے یہ الزام اپنی طرف سے تراشا تھا۔ اور یہ لوگ درحقیقت علی جریشہ سے اس بات کا انتقام لینا چاہتے تھے کہ غبن کے قضیے کے سلسلے میں جو ہیرا پھیری وہ اُس سے کروانا چاہتے

بھی اس کے لیے وہ تیار نہ تھا"۔

ملٹری پولیس نے ایک فرسٹ سارجنٹ کو بھی گرفتار کر لیا جس سے علی جریشہ ذاتی ضرورت کی اشیا مثل وغیرہ خریدا کرتا تھا۔ اُسے اسکندریہ میں مصطفیٰ پاشا چھاؤنی میں بند کر دیا گیا۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا تو میں نے جمال عبدالناصر کو اس تمام کہانی سے مطلع کیا۔ چنانچہ پھلوں کے تاجر کی رہائی تو عمل میں آ گئی۔ مگر مدعی علی جریشہ کے بارے میں کوئی کارروائی نہ کی گئی اور وہ بدستور جیل میں محبوس رہا۔

گواہ نے بتایا کہ اُن دنوں حکومت کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ لوگوں کو بلاوجہ گرفتار کر لیتی تھی، انہیں فوجی جیل میں بند کر دیا جاتا تھا، نفسیاتی طور پر انہیں اذیت دی جاتی تھی۔ فاقوں سے مارا جاتا تھا۔ قیدِ تنہائی کی سزا دی جاتی تھی۔ اسکندریہ کے مصطفیٰ کامل فوجی کیمپ میں گرفتار شدگان کو ایسی جگہوں سے گزارتے تھے جہاں انسانی ڈھانچے لٹکے ہوتے تھے۔ اور قیدیوں کی چیخیں اور آہیں بلند ہو رہی ہوتی تھیں۔ اور کتے بھونک رہے ہوتے تھے۔

دوسرا گواہ: ایک فوجی افسر دوسرے گواہ سید احمد محمد نے گواہی دیتے ہوئے بتایا:

میں نے جیل میں ایک ایسے انسانی مذبحہ کا مشاہدہ کیا تھا جس کے سامنے تمام مذابح جو آج تک قائم کیے گئے ہیں یا آئندہ تاریخ میں قائم کیے جا سکتے ہیں، ہیچ ہیں۔ میں مسلح افواج میں ایک افسر تھا۔ ۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کو کرنل محی الدین العشماوی میرے پاس آیا۔ یہ ملٹری پولیس کا ایک افسر تھا اور میرا دوست تھا۔ میں نے اس خیال سے اُس کو خوش آمدید کہا کہ وہ کسی ذاتی ضرورت کے سلسلے میں آیا ہے۔ اُس نے مجھے باہر آنے کو کہا۔ چنانچہ میں جونہی باہر نکلا وہ مجھے فوراً فوجی جیل کی طرف لے چلا۔ (گواہ نے اصرار کے ساتھ اس جیل کو باسٹیل آف مصر کہا) جیل کے اندر کا منظر کیا تھا۔ گویا کوئی جنگی میدان تھا۔ زمین پر انسانی لاشوں کے ڈھیر پڑے تھے جو خون کے اندر لت پت تھیں۔ چلتے ہوئے راستے میں بعض لاشوں پر میرے پاؤں بھی پڑتے تھے۔ ہر طرف چیخ پکار تھی، آہ و زاری تھی اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تھیں۔ مجھے جیل کے اوپریشن روم میں لے گئے۔ اس روم کے دروازے چاروں طرف سے کھلے تھے، اور اندر انسان اُلٹے لٹکے ہوئے تھے۔ جیسے قصاب جانور کو ذبح کرنے کے بعد لٹکا دیتا ہے۔ ہر انسان پر چار جلاد مسلط تھے جو کوڑوں کے ساتھ اس کی خبر لے رہے تھے۔ عذاب کا نشانہ بننے والے لوگ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی دہائی دیتے تھے۔ مارتے مارتے جب کوڑوں کی دھجیاں اُڑ جاتیں تو جلاد نئے کوڑے

لے آتے - مجھے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں انسانی لاشوں کا مُثلہ کیا جاتا تھا - میں اگلے روز شام تک اسی کمرے میں رہا اور انسانیت کے المیہ کا مشاہدہ کرتا رہا - دوسرے روز مجھے ملٹری پولیس کے ڈائرکٹر سعد زغلول اور ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائرکٹر حسن خلیل اور حسن کفافی کے سامنے حاضر ہونے کے لیے طلب کیا گیا - ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ مدّعی (علی جریشہ) کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ وہ میرا ہمسایہ ہے اور اس وجہ سے میرا اُس کے ساتھ دوستانہ تعلق ہے - لیکن اُس کے اُوپر جو الزام لگایا گیا ہے اس سے میں بے خبر ہوں - وہ کہنے لگے: کیا علی جریشہ نے تم سے ایک مرتبہ یہ سوال نہیں کیا تھا کہ مصر میں فوجی انقلاب برپا کرنے کا امکان کس حد تک ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایسی کوئی گفتگو میرے اور اُس کے درمیان نہیں ہوئی - میرے اس جواب پر ملٹری پولیس کے ڈائرکٹر نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم نے اپنی گواہی میں اس گفتگو کا اقرار نہ کیا تو تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کا تم نے اس جیل میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا ہے - جب میں نے کہا کہ میں وہی کہوں گا جو حق ہے تو انہوں نے علی جریشہ کو بلوایا اور اُسے کمرے کے اندر لے آئے - میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پہلی نظر میں مَیں علی جریشہ کو ہرگز نہ پہچان سکا - ڈھیلا ڈھالا لباس اُس کے جسم پر تھا - پاؤں سے ننگا تھا - خون میں لت پت تھا - ضربات نے اُس کے چہرے کو بالکل بگاڑ رکھا تھا - میں نے بڑی مشکل سے گھور گھور کر اُسے پہچانا - میں نے علی جریشہ سے مذکورہ گفتگو کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے صاف انکار کیا کہ ایسی کوئی گفتگو میرے اور اُس کے مابین نہیں ہوئی ہے - اس پر یکایک جہنم کے داروغے ـــــ گواہ کے الفاظ کے مطابق ـــــ علی جریشہ پر ٹوٹ پڑے اور اُسے اس قدر مارا کہ وہ زمین پر دھڑام سے گر گیا - اُسے ہاتھوں سے اُٹھا کر کھڑا کرتے کیونکہ وہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور پھر مارنے لگتے - وہ گر جاتا تو پھر اُسے پکڑ کر کھڑا کر دیتے - کچھ عرصہ تک یونہی ہوتا رہا - وہ مار کھاتا اور گر جاتا - یہاں تک کہ اُس نے اقرار کر لیا کہ واقعی اس نے مجھ سے یہ دریافت کیا تھا کہ مصر میں فوجی انقلاب برپا کرنے کا امکان کس حد تک ہے - تازیانوں کی بوچھاڑ میں اُسے ملٹری انٹیلی جنس کے دفتر میں لے جایا گیا - پھر اُسے دوبارہ فوجی جیل واپس بھیج دیا گیا جہاں وہ مسلسل ایک انتہائی تلخ اور خوفناک عذاب کی بھٹی میں جلتا رہا - صبح چار بجے قیدیوں کو کمروں سے نکالا جاتا اور کوڑوں کی زد میں انہیں بیت الخلاء لے جایا جاتا - بیت الخلاء میں ایک شخص کو صرف چند سیکنڈ بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی - اس کے بعد انہیں دستوں کی شکل میں شام تک دوڑایا بھگایا

جاتا۔ درمیان میں چند منٹوں کا وقفہ ہوتا تھا۔ قیدی جھاڑو کے بجائے اپنے ہاتھوں سے جیل کا صحن صاف کرتے تھے۔ یہ پورا عرصہ علی جریشہ ہمارے ساتھ رہا۔

گواہ نے اقرار کیا کہ مدعی (علی جریشہ) پر یہ مظالم میرے سامنے اور کرنل سعد زغلول اور حسن خلیل اور حسن کفافی کی نگرانی میں ہوئے ہیں۔ فوج کے سپاہی علی جریشہ کو ہاتھوں سے بھی مارتے تھے اور لاتوں سے بھی۔ علی جریشہ جب مضمحل ہو کر گر جاتا تو اُسے کھڑا کر دیتے تھے اور پھر اُسے مارنے لگتے تھے۔ اور اُسے ایسی فحش گالیاں دیتے تھے کہ زبان انہیں بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

تیسرا گواہ: جیل کا ساتھی | تیسرے گواہ ابراہیم منیر کا بیان:

مجھے ملٹری انٹیلی جنس کے احکام کے تحت ۲۵ اگست ۱۹۶۵ء کو گرفتار کیا گیا۔ اور اُسی روز مجھے فوجی جیل پہنچا دیا گیا۔ تین روز تک میں ایک کال کوٹھڑی کے اندر محبوس رہا اور جیل کے کسی ذمہ دار افسر کے سامنے مجھے پیش نہ کیا گیا اور نہ کوئی اور کارروائی کی گئی۔ تیسرے روز آدھی رات کے وقت یکایک تمام کوٹھڑیوں کے دروازے کھول دیے گئے اور محبوسین کو کہا گیا کہ وہ نیچے اُتر آئیں اور اپنے کوائف درج کرائیں۔ کوٹھڑی نمبر ۴۹ میری کوٹھڑی سے ملحقہ کوٹھڑی تھی۔ اس کوٹھڑی کے قیدی (علی جریشہ) نے نیچے اُترنے میں دیر لگا دی۔ چنانچہ سپاہی فوراً اُس کی طرف لپکے اور اُس پر تازیانوں کی تابڑ توڑ بوچھاڑ شروع کر دی۔ یہ زدوکوب کوٹھڑیوں کے نگران افسر صفوت الروبی کے سامنے کی گئی جو قیدی (علی جریشہ) کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک انسان انتہائی مظلومی کی حالت میں گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا ہے۔ وہ جب فوجی جیل کی کنکریٹ کی بنی ہوئی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا تو بڑی دردناک چیخیں اور آہیں اُس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ یہ سیڑھیاں اس قدر دشوار تھیں کہ صحت مند انسان بھی اُن پر اُترتے چڑھتے مضمحل ہو جاتا تھا۔ قیدی جب اپنا نام یا پتہ بتاتا تو جواب میں فوجی سپاہی اُسے ایک تازیانہ رسید کرتا۔ اور مارتے وقت وہ یہ نہ دیکھتا کہ تازیانہ کہاں لگا ہے۔ قیدی کا اِدھر اُدھر مڑ کر دیکھ لینا بھی تازیانوں کی بارش کو دعوت دے دینا تھا۔ جب تمام قیدیوں کے کوائف لکھ لیے گئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں واپس چلے جائیں۔ ۴۹ نمبر کوٹھڑی کا قیدی جس انداز سے اُترا تھا (یعنی گھٹنوں اور کہنیوں کے بل) اُسی دلگداز انداز سے وہ آہ و زاری کرتے ہوئے اوپر چڑھا۔ اور پھر وہ کئی روز تک اپنی کوٹھڑی میں بے بس پڑا

رہا۔ نہ اُسے کچھ کھانے کو دیا گیا اور نہ پینے کو۔ اور نہ کوئی تفتیشی کارروائی کی گئی۔ چونکہ میری کوٹھڑی اُس سے بالکل ملحق تھی اس لیے میں کوٹھڑی میں بیٹھا اُس کی آوازیں سُنتا رہتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس مظلوم انسان کا نام علی جریشہ ہے۔ دراصل پندرہ روز کے بعد سپاہی سراج نے اُس کی کوٹھڑی کھولی اور مجھے حکم دیا کہ میں یہ کوٹھڑی (نمبر ۴۹) صاف کروں۔ کیونکہ اس کوٹھڑی کا قیدی شدید زخموں کی وجہ سے ہلنے جلنے کی سکت نہیں رکھتا۔ میں سپاہی سراج کی نگرانی میں اس قیدی کے پاخانے کا برتن صاف کرتا تھا۔ سپاہی سراج ہم دونوں کو آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چند روز بعد میں نے سپاہی سے آنکھ بچا کر مظلوم قیدی کا نام دریافت کیا۔ اُس نے صرف اتنا کہا کہ میرا نام علی ہے۔ اُس کا مکمل نام مجھے تین چار روز بعد معلوم ہوا جب میں سپاہی کو غافل پاتا تو علی سے کچھ نہ کچھ گفتگو کر لیتا "

گواہ نے مزید بتایا کہ:

"مدعی (علی جریشہ) کی کوٹھڑی میں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ وہ گو ہلنے جلنے سے بالکل معذور ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود اُسے بار بار تحقیقات کے لیے طلب کر لیا جاتا۔ ملٹری انٹیلی جنس کے حکام اِس قیدی کو شدید عذاب میں مبتلا کر کے دوسرے نظر بندوں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرنا چاہتے تھے کیونکہ جب ایک جج کے ساتھ وہ یہ سلوک کر سکتے ہیں تو دوسرے انسان ان کی نظر میں کیا وقعت رکھتے ہیں"

میں تین ماہ تک علی جریشہ کی کوٹھڑی کی صفائی پہ مامور رہا۔ اُن دنوں گرمی بلا کی پڑ رہی تھی مگر بایں ہمہ مسکین علی جریشہ اور دوسرے قیدی پانی کے چند قطروں کو ترستے تھے۔ کھانا بہت ہی ناکافی ملتا تھا۔ اور زدوکوب کا سلسلہ لا متناہی تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ سپاہی علی جریشہ کو سوٹ پہنا رہے ہیں۔ وہ جب کھڑا ہو کر سوٹ پہن رہا تھا تو زخموں کی شدت سے وہ لرز رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے خون آلود جوتے دھو رہا ہے اور ساتھ ہی زار زار رو رہا ہے۔

نگران سپاہی کسی کام میں مشغول تھے۔ میں نے موقع پا کر علی جریشہ کو بتایا کہ جیل کے حکام تمہیں اس لیے لے جا رہے ہیں کہ تم سے ملازمت کا استعفے لکھوا لیں۔ میری بات سُن کر اُسے بڑا اشتعال ہوا۔ لیکن وہ مجھ سے کہنے لگا کہ جنرل حمزہ بسیونی نے مجھے مستعفی ہو جانے کا حکم دیا ۔۔۔ اگر میں نے انکار کر دیا تو آپ

خوب جانتے ہیں کہ میرا کیا انجام ہوگا۔ اتنی سی گفتگو کے بعد میں فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو تعذیب کا پہاڑ علی جریشہ پر ٹوٹ رہا تھا۔ یہ سلسلۂ تعذیب غیر منقطع تھا۔" ذہنی غسل" کے لیے جلادوں نے طرح طرح کے طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ ملزمان کو روزانہ دستوں کی شکل میں دوڑایا بھگایا جاتا تھا۔ اور یہ ملزمان تازیانوں اور ہاتھوں اور لاتوں کی ضربات کے تحت دوڑنے کے لیے لپک پڑتے حالانکہ وہ اس قدر شدید اور جان لیوا زخموں سے چور ہوتے تھے کہ اُن کے لیے حرکت کرنا مشکل ہوتا تھا"۔

مدعی علی جریشہ اور کچھ اور ملزم ملٹری کورٹ کے سامنے پیش کیے گئے۔ علی جریشہ ملٹری کورٹ کے سامنے اپنا دفاع نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن ملٹری انٹیلی جنس کی طے کردہ لائن سے اگر کوئی ملزم ذرا برابر بھی ہٹ جاتا تو ملٹری کورٹ کا چیئرمین بریگیڈیر علی جمال الدین عدالت برخاست کر دیتا تھا اور پھر اُسے فوجی جیل میں لے جاتے تھے اور اُسے بالکل ننگا کر کے تازیانوں کی بوچھاڑ کے نیچے برابر دوڑاتے۔ ملٹری کورٹ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے روزانہ زدوکوب کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک ملزم نے جس کا نام منصور عبدالظاہر تھا کورٹ کے سامنے تحقیقات کے نامناسب طریقہ کار کا ذکر کیا تو ملٹری کورٹ کا چیئر علی جمال الدین فوراً غضب آلود ہوگیا اور اُس نے کارروائی روک دی۔ چنانچہ اس کے بعد تمام ملزمان کو خوب سبق دیا گیا۔ مادرزاد ننگا کر کے انہیں تازیانے مارے گئے۔ اُن کے سروں پہ چوٹیں لگائی گئیں۔ لاتیں رسید کی گئیں۔ ان کا پانی بالکل بند کر دیا گیا۔ اور لمبے لمبے عرصے تک انہیں دوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ چھاتی کے بل رینگنے کا حکم دیا گیا۔ بھوکا اور پیاسا مارا گیا۔ یہ ستم ایک بار نہیں بار ہا توڑا گیا۔ مسلسل توڑا گیا"۔

گواہ نے تسلیم کیا کہ مدعی علی جریشہ ہمیشہ ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ اور اس کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چل سکتا تھا۔ اُس کے جسم کے اندر قلموں کی نوک چبھونا تو سپاہیوں کا روزانہ کا معمول تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ قلمیں روشنائی سے نہیں خون سے بھری ہوئی ہیں۔ فوجی حکام کی طرف سے علی جریشہ کو سب سے زیادہ عذاب دینے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دوسرے ملزمان کو ہراساں کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ایک جج جسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہے جب اُن کے تشدد سے محفوظ نہیں ہے تو کسی دوسرے کی کیا مجال ہے کہ وہ ان کے آہنی ہاتھوں سے بچ نکلے۔

گواہ نے دستہ سسٹم کی ستم رانیوں کا بھی ذکر کیا۔ اس سسٹم کی رُو سے قیدیوں اور ملزموں کے دستوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ دوڑیں اور اُن کے آگے جو فوجی سپاہی انتہائی تیزی کے ساتھ اور دُور فاصلے پر دوڑ رہا ہے

اُس سے طبن ۔جو قیدی اُس سپاہی سے پیچھے رہ جاتا کم از کم دس تازیانوں سے اُس کی تواضع کی جاتی ۔ آگے دوڑنے والا سپاہی ہر دس منٹ کے بعد تبدیل کر دیا جاتا تھا ۔ مگر مظلوم قیدی پورے آٹھ گھنٹے روزانہ بلا توقف دوڑتے ۔ اور جو لڑ کھڑا کر گر جاتا عذاب الیم میں مبتلا ہو جاتا ۔ جیل کے حکام قیدیوں کو جیل کا صحن ہاتھوں سے صاف کرنے پر مجبور کرتے تھے ۔صحن اگر صاف بھی ہوتا تب بھی قیدی ہتھیلیوں کے جھاڑو دے رہے ہوتے تھے ۔

گواہ نے بیان کیا کہ مدعی علی جریشہ کو کربناک عذاب دیا گیا ۔ اُسے مادر زاد ننگا کر کے اُلٹا لٹکایا جاتا رہا ۔ جو لوگ تعذیب کی مہم سر انجام دیتے تھے اُن کے نام یہ ہیں: صفوت الروبی ۔ سپاہی سراج ۔ رشاد ۔ محمد خاطر ۔افسران میں سے احسان العجاتی ۔حسن خلیل ۔شمس بدران ۔ حمزہ لبسیونی اور دوسرے لوگ ۔ حمزہ لبسیونی مدعی کو دھمکی دیا کرتا تھا کہ اُسے فنا کر دیا جائے گا ۔ نیز حمزہ لبسیونی مدعی سے برملا کہا کرتا تھا کہ وہ پراسیکیوٹر افسر جو تحقیقات پر مامور ہے مجھے اُس کا کوئی ڈر نہیں ہے ۔ میں اِس جیل کے اندر ہمہ مقتدر ہوں ۔ میں ہی پراسیکیوٹر افسر ہوں ۔ میں ہی جج ہوں ۔ میں ہی سرکاری ڈاکٹر ہوں ۔ یہ الفاظ دہرا کر وہ مدعی پر ٹوٹ پڑتا تھا تاکہ اپنی بالا دستی کا عملی ثبوت پیش کرے ۔

(باقی)

خیال در خیال

ترجمان القرآن کے تازہ شمارے سے استفادہ کرتے ہوئے

جناب نعیم صدیقی صاحب

نام نہاد "اسلامی فلم" کا ایک اور خطرناک پہلو امریکہ میں مقیم شامی کمیونسٹ مصطفیٰ العقاد کی ہدایت کاری میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک سے متعلق جو "اسلامی فلم" تیار ہو رہی ہے، اس کے فتنۂ پنہاں کو نمایاں کرنے میں آپ کا تازہ اداریہ بے حد کامیاب ہے اور بہت اچھا معلوماتی پس منظر اس میں جھلکتا ہے۔

البتہ ایک پہلو ایسا ہے جس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ کہانی اور مکالمات کتنے ہی بہترین کیوں نہ ہوں، ہدایت کار اگر چاہے تو وہ کسی بھی فلمی کردار یا کرداروں کے چہروں اور لباسوں اور ان کے فنی ڈھانچے میں ایسا انداز پیدا کر سکتا ہے، جو بالکل لاشعوری طور پر اُس کردار یا کرداروں کے متعلق کسی غلط فہمی کا ہلکا سا بُرا اثر دیکھنے والوں پر چھوڑ جائے، پھر جبکہ کردار اسلام کی نمائندگی کرنے والے ہوں، تو ایسی فنی مساعی خود اسلام کے متعلق کم سے کم غیر مسلم اقوام میں اور مسلمانوں کے اندر کے انحراف پسند "جدیدوں" میں بُرے اثرات پیدا کر سکتی ہیں۔ میرے اس دعوے کی تائید ان فرضی تصاویر سے ہو سکتی ہے جو وقتاً فوقتاً آنحضورؐ کو ایک خاص نقشے میں پیش کرتی ہیں۔

امریکی تھیٹر اور فلم پر صہیونیوں کی رُوح مُسلط ہے۔ نیز اسلام اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کے متعلق مستشرقین نے جس مہارت سے اپنی خوبصورت عبارات کے نودوں میں نشتر رکھ دیے ہیں، اُن کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ حروبِ صلیبیہ کے سانچے میں ڈھلا ہوا متعصب عیسائی ذہن فلم کے دائرے میں کتنے فنکارانہ طریق سے ضرررساں کام کر سکتا ہے۔ تیسرا مخالف اسلام عنصر کمیونسٹوں کا ہے

جو کوئی فلم بھی تبلیغ اسلام کے مقصد سے بنانے والا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جس کا اصل مدعا الحاد پیدا کرنا اور اسلام سے انحراف کے لیے ذہنوں کو تیار کرنا ہو سکتا ہے۔

ان عناصر کے ہاتھوں شروع میں اگر ایک آدھ فلم مسلمانوں کے نازک مذہبی جذبات کے لحاظ سے محتاط انداز پر بھی بن جائے تو ایسی فلم کا مسلمانوں کی طرف سے گوارا کیا جانا مذکرہ خطرے کا پھاٹک ہمیشہ کے لیے کھول سکتا ہے، درآنحالیکہ اس پھاٹک کا قفل پہلی بار کھولنے کے لیے کنجی گھمانے والے ہاتھ خود ہمارے ہی ہوں گے۔ ہم اسلام کے متعلق فلم سازی کا دروازہ کھول کر گویا اپنے دین، اپنی تاریخ اور اپنی درخشاں شخصیتوں کی من مانی عکاسی کرنے کا لائسنس یہودیوں، مستشرقین، دہریوں، کمیونسٹوں اور بھارتیوں کے حوالے کر دیں گے۔ اس خطرے کو سامنے رکھتے ہوئے میں تو یہ کہوں گا کہ اگر بہترین پارسا اور ذہین مسلمان بھی اس کام کا آغاز کریں تو بھی وہ اپنے دشمنوں کو ایک ضرر رساں قوت سے مسلح کر دیں گے۔

معاملہ محض کرداروں کے ڈھانچوں میں گڑبڑ کرنے ہی کا نہیں (اور ہر مصنوعی کردار بجائے خود گڑبڑ کی ایک صورت ہے ہی!) بلکہ ان کی زبانوں سے ادا ہونے والا بسا اوقات ایک جملہ اور ان کے تاریخی عمل کی عکاسی میں ایک خلافِ حقیقت جنبش اُن کے متعلق اور خود اسلام کے متعلق ذہنوں میں خلل پیدا کر سکتی ہے۔

اس سے پہلے ہمیں اہلِ مغرب اور ہنود کی لکھی ہوئی تاریخوں کا تجربہ ہے کہ کس طرح مسلم تاریخ کے بعض ابواب اور بعض شخصیتوں کو اس بُری طرح مسخ کیا گیا ہے کہ اُن کے اثرات کا ازالہ کرنا آسان نہیں۔ یہاں برصغیر کی تاریخ میں اکبر اور اورنگ زیب کی تصاویر میں جس بے باکی سے غلط رنگ بھر اگیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ کیا ہم مسلمان اب اپنی تاریخ کے مقدس ترین دور کے متعلق بھی ایسے ہی تلخ تجربے سے دوچار ہونا چاہتے ہیں — اور وہ بھی کتابی مواد سے دس گنا زیادہ وسیع الاثر راستے سے!

ایک فلم ہزارہا افراد کے ذہنوں میں جن کی اکثریت اَن پڑھ، یا کم خواندہ اور دینی حقائق کے وسیع شعور سے خالی ہوتی ہے، ایسے بیج بو سکتی ہے کہ اُن سے اُگنے والے اشجارِ خبیث زہریلے کانٹے بکھیرتے رہیں اور صحیح الفکر لوگ بے بسی سے اس آفت کو دیکھتے رہیں یا زیادہ سے زیادہ احتجاجی انداز پر آہ و فغاں کر لیں مگر کسی نام نہاد "اسلامی فلم" سے متاثر شدہ عوام کے وسیع حلقوں کو چشم و گوش کی راہ سے دماغی زہر خورانی کا شکار بنانے والوں سے بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکیں۔

تائید میں میں ایک تازہ ترین خبر پیش کرتا ہوں ۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے ٹیلی ویژن پروگراموں کے خلاف تشویش ظاہر کرتے ہوئے احتجاجاً کہا ہے کہ :

" ان پروگراموں میں نہ صرف واقعاتی غلطیاں ہوتی ہیں بلکہ عام دیکھنے والے یہ تاثر قائم کرتے ہیں کہ بعض نہایت اہم حکمرانوں کا کردار درحقیقت قابل مذمت تھا ۔

......" ہماری تاریخ کو ہماری آنکھوں کے سامنے مسخ کیا جا رہا ہے " (نوائے وقت مورخہ ۱۰ رجون ۱۹۷۵ء ص ۲ ، کالم ۲،۳ ۔)

یہ کارنامہ خود ہمارے اپنے مسلمانِ کرام کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے ۔ اور اگر آپ ان لوگوں کو تصوّر میں لائیں جنہوں نے سندھ کی تاریخ میں داہر جیسے مجسمۂ ظلم و شیطنت کو ایک چہیتے محبِ وطن کردار سے آراستہ کر کے محمد بن قاسم کے پاکیزہ کردار کو بدترین صورت میں مسخ کیا ہے ، انہیں اگر ٹیلی ویژن پر من مانے طرز پر کام کرنے کا موقع مل جائے یا اپنی تاریخ کو اپنے تصورات کے مطابق فلمانے کا ٹھیکہ انہیں دے دیا جائے تو فاسد پروپیگنڈے کی یہ یلغار کتنی خوفناک ہو گی ۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری تاریخ اور خصوصاً اس کا مقدس ترین دَور مسلم دشمن فلم سازوں کے ہتھے چڑھ جائے تو کیا کیا قیامتیں نہ گزر جائیں ۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنی نادانیوں اور دشمنوں کی عیاریوں سے بچائے ۔

(۲)

موجودہ جمہوریت کش ماحول میں دعوتِ اسلامی کا کام " دعوتِ اسلامی کی کامیابی کا راستہ " کے عنوان سے مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف سے صوبائی تربیت گاہ میں چند روزمرّہ پیش آنے والے سوالات کے جواب میں بڑے سے موثر انداز میں کام کی باتیں کارکنانِ تحریکِ اسلامی سے کہی گئی ہیں ۔ مولینا اپنے موجودہ دورِ عمر و صحت میں کسی موقع پر جو مختصر ارشادات پیش کرتے ہیں وہ ہمارے تحریکی سرمایۂ فکر میں گرانقدر اضافہ کا باعث بنتے ہیں ۔ اِن ارشادات کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اب مولینا کی وسعتِ علم کے ساتھ تہائی صدی کے تحریکی کام کا عملی تجربہ بھی شامل ہے ۔ کاش کہ لوگ ان چیزوں کو فکر و تدبر کے ساتھ پڑھیں ، اور اپنی روزمرّہ پالیسیوں اور اقدامات کی تشکیل میں ان سے مکمل استفادہ کریں ۔

میں نے اس حصّہ کو بغور پڑھا اور جہاں جہاں کوئی چیز خاص طور پر دامن کش توجہ ہوئی وہاں

رُک کر حالات کو سوچا۔

مثلاً ۱۸۵/۳۵ صفحے کا دوسرا سوال موجودہ جمہوریت کُش فضا میں اسلام کو جمہوری طریقِ دعوت سے پیش کرنے پر اُس اشکال کا عکاس ہے جو بکثرت ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ اس پوری بحث سے تو غرض کرنا مقصود نہیں، البتہ اس کے ایک پہلو کو اُبھارنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے فرمایا:

"اسلام کا کام کرنے کے لیے کُھلی ہموار شاہراہ تو کبھی نہیں ملی ہے۔ یہ کام تو جب بھی ہوا، جبر و ظلم کے مقابلے میں ہر طرح کی کڑیاں جھیل کر ہی ہوا، اور وہ لوگ کبھی یہ کام نہ کر سکے جو یہ سوچتے رہے کہ جاہلیت کے علمبرداروں کی اجازت، یا اُن کی عطا کردہ سہولت ملے تو وہ راہِ خدا میں پیش قدمی کریں۔ آپ جن برگزیدہ ہستیوں کے نقشِ پا کی پیروی کر رہے ہیں، اُنھوں نے اُس ماحول میں یہ کام کیا تھا جہاں جنگل کا قانون نافذ تھا اور کسی شہری آزادی یا بنیادی حق کا تصور تک موجود نہ تھا......... جب ایک معقول اور دل لگتی بات کو عمدہ اخلاق کے لوگ لے کر کھڑے ہوں، اور سخت سے سخت ظلم و ستم سہنے کے باوجود اپنی بات ہر حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے چلے جائیں تو لازمی طور پر اس کے تین نتائج رونما ہوتے ہیں۔ ایک نتیجہ یہ کہ اس صورتِ حال میں بہت زیادہ باہمت اور اولوالعزم لوگ ہی اس دعوت کو علانیہ قبول کرتے ہیں اور وہ اس کے لیے ایسا قیمتی سرمایہ ثابت ہوتے ہیں جو کسی دوسری صورت میں بہم نہیں پہنچ سکتا۔ دوسرا نتیجہ یہ کہ اس خوفناک فضا میں بکثرت، بلکہ بے اندازہ لوگ اس دعوت کو دل میں مان لیتے ہیں مگر آگے بڑھ کر اس میں شامل نہیں ہوتے۔ مخالف طاقت آخر کار اس کا نقصان خود اُٹھاتی ہے۔ اسے قطعی اور حتمی شکست ہونے تک کبھی یہ پتہ ہی نہیں چلنے پاتا کہ جس دعوت کو مٹا دینے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے، اس کے حامی کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ اُس کی اپنی صفوں تک میں موجود ہوتے ہیں اور وہ اُن سے بے خبر رہتی ہے۔ تیسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخلاقی برتری اور دعوت کی معقولیت اور صداقت اپنی فطری طاقت سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے دشمن اس کے پیرووں پر جتنا زیادہ ظلم کرتے ہیں اُتنے ہی وہ

ہر شریف النفس اور نیک طبع انسان کی نظر سے گرتے جاتے ہیں۔ اُس کے پیرو جتنی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ ظلم برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی حق پرستی سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے، اتنی ہی اُن کی قدر و منزلت عام دیکھنے والوں ہی میں نہیں بلکہ خود دشمنوں کی صفوں میں بھی بڑھتی چلی جاتی ہے .... یہ تو حق کی کامیابی کا فطری راستہ ہے"۔

اصل میں یہ اس اضطراب کا جواب ہے جو دعوتِ اسلام کو معلّمانہ، اخلاقی اور جمہوری اسلوب سے پیش کرنے میں موجودہ جمہوریت کش ماحول میں پیش آرہا ہے۔ متذکرہ جواب میں ایک حقیقت مضمر ایسی ہے جسے میں نمایاں کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ تاریخ انسانی میں جہاں ظلم و تشدّد کی ایک قوت کام کرتی دکھائی دیتی ہے، وہاں اس کے جواب میں مظلومیّت خود ایک ایسی دوسری قوت ہے جس نے بارہا انسانی افکار و کردار کو بدلا اور تاریخی رَو کا رُخ موڑا ہے۔ اپنے اقتدار اور مفاد کے لیے ظلم کرنا بھی ایک چیز ہے، اگر ذاتی نفع و نقصان سے بے نیاز ہو کر دعوتِ حق پر ثابت قدم رہتے ہوئے ظلم سہنا بھی ایک زبردست تاریخی و سیاسی محرک ہے۔ یہ حقیقت اگر سامنے ہو جسے قرآن نے بہت اچھی طرح اُجاگر کیا ہے، تو پھر عزم و ثبات کے ساتھ صبر کا مظاہرہ بڑے دُور رس اثرات رکھتا ہے۔

ایک اور چیز جو ہمارے کارکنوں کی نگاہ میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم مادی قوتوں کے علاوہ ایسے فوق الانسانی عوامل کو بھی تاریخ میں فیصلہ کن پارٹ ادا کرتے دیکھتے ہیں جن کو مشیت کے زیرِ عنوان دکھا جاسکتا ہے اور جس کی ایک ذرا سی جھلک قصہ خضر میں دکھائی گئی ہے۔ یہی مشیت کی قوت کبھی ناسازگار حالات میں یکایک ایسا نیا راستہ کھول دیتی ہے جس کا عقلی طور پر پیشتر سے کوئی تصور نہیں ہوتا۔ بارہا فضائے ترقی میں بال جُنباں تو تیں بلند پروازی کرتے کرتے یکایک نیچے گر جاتی ہیں۔ کتنے ہی تخت اُلٹتے رہتے ہیں، کتنے ہی تاج ہمارے سامنے ٹھوکروں کی زد میں آئے۔ کتنے ہی حالات ہیں جن سے برآمد ہونے والے نتائج کے بارے میں لوگوں نے جو قطعی اندازے کیے تھے، وہ وقت آنے پر بالکل غلط ہو کر رہ گئے۔ انڈونیشیا میں کمیونسٹ انقلاب کے لیے دس سال پہلے وسیع افرادی قوت نے اپنی مکمل تیاری کر لی تھی کہ کوئی راہ نجات دکھائی ہی نہ دیتی تھی، مگر لمحہ معین آیا تو انقلاب کو پہلا قدم اُٹھاتے ہی شکست ہو گئی۔ ابھی پرتگال میں سُرخ انقلاب اُمڈ رہا تھا، مگر فوجی تسلّط کے باوجود (باقی برصفحہ ۴۴)

رسائل و مسائل

گنہگار مومن اور "نیکو کار" کافر کا فرق

سوال :- آج کل ایف - ایس سی کی طالبہ ایک نہایت ہی ذہین مسیحی لڑکی میرے پاس انگریزی پڑھنے آتی ہے - وہ تقریباً روزانہ مجھ سے مذہبی اُمور پر تبادلۂ خیالات کرتی ہے۔ میں بھی اِس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اسے دین اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرنے کی کوشش کرتا ہوں - بحمداللہ کہ میں نے دینِ اسلام کے بارے میں اس کی بہت سی غلط فہمیوں کو دُور کر دیا ہے۔

لیکن ایک دن اس نے میرے سامنے ایک سوال پیش کیا جس کا جواب مجھے نہ سوجھ سکا - ازاں بعد میں نے آپ کی تصانیف سے بھی رجوع کیا مگر تاحال کوئی شافی اشارات وہاں سے نہیں مل سکے ۔

میری مسیحی شاگرد کہنے لگی کہ میں نے میٹرک میں اسلامیات کے کورس میں ایک حدیث پڑھی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمان چاہے کتنا ہی بڑا گنہگار ہو وہ کچھ عرصہ دوزخ میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر آخر کار ضرور جنت میں چلا جائے گا - مگر کافر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے - پھر وہ کہنے لگی آپ ہمیں بھی کافر ہی سمجھتے ہیں - کوئی عیسائی خواہ وہ کتنا ہی نیکوکار ہو مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق دوزخ ہی میں جائے گا - آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟

جواب :- آپ اپنی شاگرد کو پہلے یہ بات سمجھائیں کہ گناہ گار مومن اور نیکوکار کافر کے درمیان فرق کی

بنیاد کیا ہے۔ مومن اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری قبول کر کے اس کے وفادار بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنی اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے وہ کسی جرم یا بعض جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ اس کے برعکس کافر دراصل ایک باغی ہوتا ہے اور آپ کے کہنے کے مطابق اگر وہ نیکوکار ہو بھی تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس نے بغاوت کے جرم پر کسی اور جرم کا اضافہ نہیں کیا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص باغی نہیں ہے اور صرف مجرم ہے اسے صرف جرم کی حد تک سزا دی جائے گی، بغاوت کی سزا اس کو نہیں دی جا سکتی، کیونکہ جرم کرنے کی وجہ سے کوئی شخص وفادار رعیت کے زمرے سے خارج نہیں ہو جاتا۔ لیکن بغاوت بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے، اس کے ساتھ اگر کوئی شخص دوسرے جرائم کا اضافہ نہ بھی کرتا ہو تو اسے وہ حیثیت کسی طرح نہیں دی جا سکتی جو وفادار رعیت کو دی جاتی ہے۔ وہ بغاوت کی سزا بہر حال پا کر رہے گا خواہ وہ اس کے علاوہ کسی جرم کا ارتکاب نہ کرے۔ لیکن اگر وہ باغی ہونے کے ساتھ کچھ جرائم کا مرتکب بھی ہو تو اسے بغاوت کی سزا کے ساتھ ان دوسرے جرائم کی سزا بھی دی جائے گی۔

اس اصولی بات کو جب وہ سمجھ لیں تو ان کو بتائیے کہ اللہ تعالیٰ کی وفادار و فرمانبردار رعیت میں صرف وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو کسی قسم کے شرک کی آمیزش کے بغیر، اور اللہ کے سب پیغمبروں کو کسی استثناء کے بغیر، اور اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کسی کا انکار کیے بغیر مانتے ہوں اور آخرت کی جواب دہی کو بھی تسلیم کرتے ہوں۔ ان میں سے جس چیز کو بھی آدمی نہ مانے گا وہ باغی ہوگا اور اسے خدا کی وفادار رعیت میں شمار نہ کیا جا سکے گا۔ اب مثال کے طور پر رسولوں اور کتابوں ہی کے معاملہ کو لے لیجیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی انجیل کو جب یہودیوں نے نہ مانا تو وہ سب باغی ہو گئے، اگرچہ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے انبیاء اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو وہ مانتے تھے۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے تک حضرت عیسیٰؑ کے پیرو اللہ کی وفادار رعیت تھے۔ لیکن جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا تو وہ بھی باغی ہو گئے۔ مسیح اور انجیل اور سابق انبیا اور ان کی کتابوں کو ماننے کے باوجود وہ اللہ کی وفادار رعیت میں شمار نہیں ہو سکتے۔

یہ بات بھی جب وہ سمجھ لیں تو انہیں بتائیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت باغیوں کے لیے نہیں بنائی ہے بلکہ اپنی وفادار و فرمانبردار رعیت کے لیے بنائی ہے۔ اس وفادار رعیت میں سے اگر کوئی شخص کوئی ناقابلِ معافی جرم کرتا ہے یا اس نوعیت کے بہت سے جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اسے اس کے جرائم کے

مطابق سزا دی جائے گی اور جب وہ اپنی سزا بھگت لے گا تو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ لیکن جس نے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے وہ کسی طرح جنت میں نہیں جا سکتا۔ اُس کا مقام بہر حال دوزخ ہے۔ دوسرے کسی جرم کا وہ مرتکب نہ بھی ہو تو بغاوت بجائے خود اتنا بڑا جرم ہے جس کے ساتھ کوئی نیکی بھی اسے جنت میں نہیں پہنچا سکتی۔

حروفِ مُقطّعات کے بارے میں ایک سوال

سوال:۔ تفہیم القرآن میں حروفِ مقطعات کے بارے میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ اسلوب شعراء جاہلیت میں معروف تھا جو بعد میں متروک ہو گیا اس سلسلے میں چند معروضات ہیں۔

۱۔ کیا اس کی مثال شعراء جاہلیت کے اشعار میں یا خطبا کے خطبوں میں ملتی ہے؟

۲۔ صحابہ کرامؓ کے اقوال میں اس کے اثبات میں کچھ منقول ہے؟

۳۔ کیا حروفِ مقطعات کا اسلوب اگر بعد میں متروک ہو گیا، تو یہ "عربی مبین" کے خلاف تو نہیں؟

جواب:۔ حروف مقطعات کے متعلق تفصیلی مطالعہ و تحقیق کی اگر آپ کو فرصت نہ ہو تو صرف "لسان العرب" کی پہلی جلد میں باب تفسیر الحروف المقطعۃ ہی دیکھ لیجیے۔ اس میں اول تو یہ معلوم ہو گا کہ مفسرین نے ان کی مختلف تعبیریں کی ہیں۔ پھر مشہور ماہر لغت الزجاج کا یہ قول آپ کو ملے گا کہ اہل عرب ایک حرف بول کر کوئی ایسا کلمہ اس سے مراد لیتے تھے جس میں وہ حرف پایا جاتا ہو۔ اس کی مثال میں انہوں نے یہ مصرع پیش کیا ہے کہ:

قلت لہا قفی فقالت قٍ

یعنی "قٍ" سے مراد ہے اَقِفُ۔ اسی طرح انہوں نے یہ شعر بھی مثال کے طور پر نقل کیا ہے:

نادیتھم ان الجموا اَلاتا

قالوا جمیعا کلھم اَلافا

یعنی اَلاَ تا" سے مراد ہے اَلاَ ترکبون؟ اور اَلا" فا" سے مراد ہے اَلا فارکبوا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طرزِ بیان قدیم اہل عرب میں رائج تھا، اس لیے وہ ایسے حروف کا مدعا سمجھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں کسی عرب نے ان حروف کے استعمال پر اعتراض نہیں کیا۔ لیکن بعد میں چونکہ یہ رائج نہیں رہا، اس لیے قرآن مجید کے تمام حروف مقطعات کا مطلب متعین کرنا، یعنی یہ معلوم کرنا کہ ہر حرف کس کلمہ پر دلالت کرتا ہے مشکل ہوگیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی دلالت متعین کرنے میں اختلافات ہوئے ہیں اور کسی ایک تعبیر پر اتفاق نہیں ہوسکا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اتنے کثیر مقامات پر قرآن مجید میں ایسے حروف کا استعمال، جن کے معنی اب ٹھیک ٹھیک متعین نہیں ہوسکتے، اس کتاب کے عربی مبین ہونے میں قادح تو نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے معنی معلوم نہ ہونے سے اُس ہدایت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا جو انسان کو قرآن میں دی گئی ہے۔ اگر اس میں کوئی ادنیٰ سا خلل بھی واقع ہونا ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود ان کی تشریح فرما دیتا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فریضہ انجام دیتے۔

جستجوئے حق کا صحیح طریقہ

سوال:- اگر ایک آدمی حق کی تلاش میں ہے اور وہ دل سے اس کی کوشش کرتا ہے لیکن اُسے کافی جدوجہد کے بعد بھی وہ نہیں ملتا تو کیا وہ بیچارا حوصلہ ہار نہیں بیٹھے گا؟ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک آدمی انتہائی تاریکی میں اس غرض سے سفر کرتا ہے کہ کہیں روشنی کا چراغ اسے ملے۔ لیکن سفر کرتے کرتے روشنی کا نشان تک اسے نہیں ملتا۔ آخر کو بیچارا تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ روشنی سرے سے ہے ہی نہیں، اگر کچھ ہے تو بس گھُپ اندھیرا۔

مولانا محترم، آپ کہیں گے کہ میں نے یہ ایک محض فرضی مثال پیش کی ہے۔ میں انسانی زندگی میں عملی مثال پیش کرتا ہوں۔ دو آدمی ہیں جو شعوری طور پر اور رسمی طور پر مسلمان ہیں۔ شروع شروع میں دونوں دو حصاروں کے اندر بند ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک حصار زندگی میں مصیبتوں تکلیفوں اور ناکامیوں کا حصار ہے۔ ایک آدمی پہلے حصار

سے باہر نکل آتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ اب ایک ہی حصار اس کے لیے باقی ہے جس سے نکل کر وہ آزاد ہو جائے گا۔ اس طرح اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور جب وہ دوسرے حصار سے بھی باہر نکل آتا ہے تو آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ تجربہ اُسے مطمئن کر دیتا ہے اور وہ ایسی ذات کا قائل ہو جاتا ہے جو مصیبت زدہ کی پکار کو سُنتی ہے اور مدد کرتی ہے۔ مگر دوسرا شخص ایک حصار سے نکلتا ہے تو دوسرا حصار، اور دوسرے سے نکلتا ہے تو تیسرا حصار اسے گھیر لیتا ہے، یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے بیہم حصار پر حصار اُسے گھیرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مسلسل چکر اسے قطعی مایوس کر دیتا ہے اور وہ کسی ایسی ذات سے جو مصیبت میں کام آئے مکمل طور پر ناامید ہو جاتا ہے، کیونکہ بیچارا بار بار چلاتا ہے کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ؟ اور کبھی بیچارے کو اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ یہ شخص اس لیے ناامید ہو گیا ہے کہ بیچارے کی بیشتر خواہشات میں سے ایک بھی پوری نہیں ہوئی اور بیس تکلیفوں میں سے ایک بھی رفع نہیں ہوئی۔ اگر کوئی ایک خواہش بھی پوری ہو جاتی، یا ایک تکلیف بھی رفع ہو جاتی تو وہ اس بات سے کلی طور پر مایوس نہ ہوتا کہ اوپر کوئی بالاتر ہستی دُعائیں سُننے اور حاجتیں پوری کرنے والی موجود ہے۔

جواب :- آپ نے اپنے سوال کے آغاز میں جو بات لکھی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حق کی تلاش ایک بنیادی خوبی ہے جو حق پانے کے لیے شرط اوّل کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ تلاشِ حق مخلصانہ ہو، بلاتعصب ہو، اور دانشمندی کے ساتھ ہو۔ یعنی آدمی اِس تلاش کے دوران میں حق اور باطل کے درمیان تمیز کرتا رہے اور جو چیز باطل نظر آئے اُسے چھوڑ کر حق کو قبول کرتا چلا جائے۔ اس صورت میں بہ امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ آدمی کو گھُپ اندھیرے کے سوا کچھ نہ ملے۔

سوال کے دوسرے حصے میں آپ نے جو مثال پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تلاشِ حق برائے تلاشِ حق نہیں بلکہ اس غرض سے کر رہے ہیں کہ آپ مصیبتوں اور تکلیفوں اور ناکامیوں کے حصار سے نکل جائیں، اور آپ کو مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ کے جواب میں اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ کی آواز نہ صرف یہ کہ سُنائی دینے لگے بلکہ وہ جواب دینے والی ہستی آپ کے مصائب اور تکالیف اور ناکامیوں کا مداوا بھی کر دے۔

میرے نزدیک تلاشِ حق کے لیے یہ نقطۂ آغاز ہی سرے سے غلط ہے جس کی وجہ سے آپ کو مایوسی لاحق ہوئی ہے۔ حق کی تلاش کا صحیح راستہ جو آپ کو اختیار کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ:

سب سے پہلے مطالعہ اور غور و فکر سے آپ یہ تحقیق کریں کہ آیا کائنات کا یہ نظام بے خدا ہے؟ یا بہت سے با اختیار خداؤں کی تخلیق سے بنا ہے اور وہ سب اِس کا نظام چلا رہے ہیں؟ یا اِس کا ایک ہی خالق و مالک اور حاکم و منتظم ہے؟

اِس کے بعد آپ اِس کائنات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ تحقیق کریں کہ آیا یہ دار العذاب ہے؟ یا عیش کدہ ہے؟ یا یہ دار الامتحان ہے جس میں لذت اور الم، تکلیف اور راحت، کامیابی اور ناکامی، ہر چیز آزمائش کے لیے ہے؟

پھر آپ اِس دنیا میں انسان کی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ آیا وہ یہاں بالکل آزاد اور مختار مطلق ہے اور کوئی بالاتر طاقت اُس کی قسمت پر اثر انداز ہونے والی نہیں ہے اور کسی بالاتر ہستی کے سامنے وہ جواب دہ نہیں ہے؟ یا زمین اور آسمان میں بہت سے خدا اس کی قسمت کے مالک ہیں؟ یا ایک ہی خدا اُس کا اور ساری دنیا کا خالق و حاکم ہے، اور وہ مختارِ مطلق ہے، ہماری لگائی ہوئی شرطوں کا پابند نہیں ہے، اور وہ ہمارے آگے جواب دہ نہیں بلکہ ہم اُس کے آگے جواب دہ ہیں، اور وہ یہاں اچھے اور بُرے سب طرح کے حالات میں رکھ کر ہمارا امتحان لے رہا ہے جس کا نتیجہ اِس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں نکلے گا؟

اِن تین سوالات میں سے اگر آپ کی تحقیق ہر ایک کا جواب پہلی یا دوسری شکل میں دے تو آپ کو مایوسی کی حالت سے نکل کر معبد کا راستہ پانے کی کوئی صورت بتانا میرے بس میں نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ کی تحقیق ہر سوال کا جواب تیسری شکل میں دے تو یہی جواب آپ کو اطمینانِ قلب کی منزل تک پہنچا سکتا ہے، بشرطیکہ آپ مزید غور و فکر کر کے اس کے منطقی مضمرات (LOGICAL IMPLICATIONS) کو اچھی طرح سمجھتے چلے جائیں۔

جب خدائے وحدہٗ لاشریک ساری کائنات کے انتظام کو چلا رہا ہے تو کائنات کی آبادی کے بے شمار افراد میں سے کسی فرد کا یہ چاہنا ہی سرے سے غلط ہے کہ خدا کی ساری خدائی صرف اُس کے مفاد میں کام کرے۔

اور جب یہ دنیا دار الامتحان ہے تو اس میں پیش آنے والی ہر خوشی اور رنج، ہر مصیبت اور راحت، ہر کامیابی اور ناکامی دراصل انسان کی آزمائش کے لیے ہے۔ یہ بات جس شخص کی بھی سمجھ میں آجائے گی وہ

نہ کسی اچھی حالت پر اِترائے گا اور نہ کسی بُری حالت پہ دل شکستہ ہوگا، بلکہ ہر حالت میں اس کی کوشش یہ ہوگی کہ خدا کے امتحان میں کامیاب ہو۔ دنیا کے موجودہ نظام کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد آدمی یہاں ایسی غلط تمنائیں دل میں پلے گا ہی نہیں کہ اِس زندگی میں اُسے خالص عیش اور بے لاگ لذت اور بے آمیز راحت اور دائمی کامیابی نصیب ہو اور کبھی اسے مصیبت، تکلیف، رنج اور ناکامی سے سابقہ پیش ہی نہ آئے۔ کیونکہ یہ دنیا نہ عیش کدہ ہے اور نہ دارالعذاب کہ یہاں محض لذت یا محض الم، یا محض راحت یا محض تکلیف، یا محض کامیابی یا محض ناکامی کہیں پائی جا سکے۔

اسی طرح جب تیسرے سوال کا جواب آپ تحقیق سے یہ پالیں کہ خدائے واحد خالق وحاکم ہے اور ہم مخلوق ومحکوم، اور یہ کہ وہ مختارِ مطلق ہے اور ہم اس کے بندے ہوتے ہوئے اُسے اپنی شرطوں کا پابند نہیں بنا سکتے، اور یہ کہ وہ ہمارے سامنے نہیں بلکہ ہم اس کے سامنے جواب دہ ہیں، تو آپ کا ذہن کبھی خدا سے ایسی غلط توقعات وابستہ نہ کرے گا کہ ہم خود جس حالت میں رہنا چاہیں وہ ہمیں اُسی حالت میں رکھے اور ہم جو درخواست بھی اُس سے کریں وہ ضرور اُسی شکل میں اُسے پورا کرے جو ہم نے تجویز کی ہے اور ہم پر کوئی تکلیف یا مصیبت اگر آ ہی جائے تو ہمارے مطالبے پر وہ اُسے فوراً دفع کر دے۔

مختصر بات یہ ہے کہ صحیح معرفت کا ثمرہ اطمینان ہے جو ہر اچھے یا بُرے حال میں یکساں قائم رہتا ہے، اور معرفت کے فقدان کا نتیجہ بہر حال بے چینی، اضطراب اور مایوسی ہے خواہ عارضی طور پر انسان اپنی کامرانیوں سے غلط فہمی میں پڑ کر کتنا ہی مگن ہو جائے۔ آپ مایوسی سے نکلنا چاہتے ہوں تو پہلے حقیقت کا عرفان حاصل کرنے کی فکر کریں، ورنہ کوئی چیز بھی آپ کو گھُپ اندھیرے سے نہ نکال سکے گی۔

(بقیہ خیال و رخیال) انتخابات ہوئے تو نتیجہ برعکس نکلا۔ ایسی مثالیں بے شمار ہیں۔

فی الحقیقت کسی اسلامی تحریک کے لیے دیکھنے کی چیز صرف ظاہری حالات اور مادی عوامل ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ تاریخ کی حرکت میں مشیت کو اہم ترین عامل مانتی ہے۔

پس کسی جمہوریت کُش فضا اور کسی ظلم و جبر کے ماحول سے داعیانِ حق کو مایوسانہ اثر نہیں لینا چاہیے، بلکہ وہ صبر و ثبات کے ساتھ تسلسل سے اپنا داعیانہ و معلمانہ کام انفرادی زندگیوں سے لے کر سیاست کے دائروں تک ہر امکانی صورت میں زور شور سے جاری رکھیں۔

مطبوعات

نوائے بُردہ | تالیف: جناب فروغ احمد صاحب

شائع کردہ: ادب اسلامی پبلیکیشنز۔ لاہور صفحات: ۱۵۲ قیمت: -/۵ روپے

زیر تبصرہ کتاب علامہ البوصیری (المتوفی ۶۹۶ھ) کے شہرہ آفاق قصیدہ بُردہ کا منظوم اُردو ترجمہ ہے۔ اس قصیدہ نے دنیا میں جو شہرت حاصل کی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاید ہی دنیا کی کوئی ایسی زبان ہو جس میں اس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔

ترجمے کے علاوہ اس کی متعدد شروح بھی کی گئی ہیں۔ یہ قصیدہ ایک لافانی نذرانۂ عقیدت ہے جو حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فدائی اور جاں نثار نے اپنے آقا کی بارگاہ اقدس میں پیش کیا ہے۔ ہم اسے اُردو ادب کی خوش بختی خیال کرتے ہیں کہ اس بے نظیر قصیدہ کو فروغ احمد صاحب جیسے صاحبِ دل اور قادر الکلام شاعر نے اُردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے انسان اپنے اندر قریب قریب وہی کیفیات محسوس کرتا ہے جو عربی قصیدے کے مطالعے سے دل پر طاری ہوتی ہیں۔ ہم اس کامیاب کوشش کے لیے فاضل مصنف کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

مبادیاتِ فنِ مباحثہ | تالیف: ابوالاعجاز حفیظ صدیقی

ناشر: مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ۔ صفحات: ۱۸۴ قیمت: -/۱۰ روپے

۳۲۔اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

یہ قابل قدر کتاب نوجوان طلبہ کے فکری نشوونما خصوصاً اظہارِ خیال کی قوت کی تربیت کے لیے مرتب کی گئی ہے اور اپنے مقصد میں بڑی کامیاب کوشش ہے۔ جو نوجوان تقریر کے میدان میں ترقی کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بڑا مفید ہے۔ کتابت اور طباعت کا معیار عمدہ ہے۔

نوجوانوں سے خطاب تالیف : اسعد اللہ خاں بی۔ ایس سی علیگ

ملنے کا پتہ : اسعد اللہ خاں ہومیو پیتھ۔ اکبر روڈ۔ کراچی ۱

صفحات : ۳۵۱ قیمت چھ روپے

عمرانیات طب پر ماضی میں بعض مفید کتب لکھی گئی تھیں۔ آج یورپ میں اس موضوع پر ہر سال متعدد کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں مگر دورِ حاضر کے سرمایہ اُردو میں اس نوعیت کی کتابیں بہت کم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوان اس موضوع پر مغربی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں جس سے ان کے اندر تخریبی رجحانات اُبھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں نوجوانوں کو اپنی جوانی کے تحفظ اور بُری عادات سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے مفید مشورے دیے گئے ہیں۔ کاش اس کتاب کا انداز بیان زیادہ سلجھا ہوا ہوتا تاکہ نوجوان اسے دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتے۔ لیکن اس کمی کے باوجود یہ کتاب مفید ہے۔

آئینہ حق تالیف : مولانا ابو النصر منظور احمد شاہ صاحب

ناشر : مکتبۂ فریدیہ ہائی سٹریٹ ساہیوال۔

صفحات : ۱۲۵ قیمت : ساڑھے چھ روپے

کتاب کے فاضل مصنف ذہنی اعتبار سے مناظر ہیں اس لیے انہوں نے مسیحوں کی طرف سے اُٹھائے جانے والے اعتراضات کو یکجا کر کے اُن کے جوابات تحریر کر دیے ہیں۔ مباحث کے چند عنوانات یہ ہیں:

وراثت ابراہیمی میں ذبیح اللہ کون ہے، ردّ الوہیت، تردید مسئلہ کفارہ، تردید عقیدہ تثلیث، تحریف بائیبل۔ تناقضات بائیبل۔

کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر بہت سے موضوعات پر محیط ہے۔ انداز بیان مناظرانہ ہے۔ طباعت اور کتابت معیاری ہے۔

(بقیہ اشارات) کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔

خالق کائنات کے نوع بشری پر لاتعداد احسانات میں یہ بھی ایک بڑا احسان ہے کہ اس نے انسانوں کے جسمانی تحفظ کے ساتھ ساتھ اُن کے اخلاقی تحفظ کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا ہے اور اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ جسمانی بیماری کے احساس کی طرح اخلاقی عوارض کا احساس بھی انسانوں میں کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہتا ہے خواہ اسے مٹانے کے لیے کتنی ہی تدبیریں کی جائیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ آزاد شہوت رانی کے حق میں بعض لوگوں نے کس قدر زوردار پراپیگنڈہ کیا ہے اور کن کن دلائل کے ساتھ اسے انسان کی ایک فطری ضرورت قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ پھر عملی میدان میں اس گھناؤنے جرم کی پوری طرح حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور ایسے حالات پیدا کیے گئے ہیں جن میں اسے قانونی تحفّظ حاصل ہوگیا ہے لیکن ان ساری کاوشوں اور حیلہ سازیوں کے باوجود اسے ہر انسان گناہ ہی سمجھتا ہے خواہ اس کا مرتکب اسے ایک ناگزیر بُرائی یا ناگزیر ضرورت کا نام دے کر اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ جس طرح کسی بستی کے سارے افراد اگر وبائی مرض کی لپیٹ میں آجائیں تو اُن کے اندر یہ احساس پیدا نہیں ہوسکتا کہ وہ تندرست ہیں بالکل اسی طرح اگر پورا معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار ہوجائے تو اس کے افراد اس ابلہ فریبی میں مبتلا نہیں ہوسکتے کہ وہ اخلاقی اعتبار سے ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کے اندر اپنی اخلاقی گراوٹ کا چبھتا ہوا احساس ہمیشہ موجود رہتا ہے جو انہیں کسی کل چین نہیں لینے دیتا۔

پھر اسی احساس زیاں کو زندہ رکھنے کے لیے قدرت نے دوسرا انتظام یہ کیا ہے کہ کوئی قوم جب بُرائی کے راستہ پر چند قدم آگے بڑھتی ہے تو اس کے بھیانک نتائج کھل کر اُس کے سامنے آنے لگتے ہیں جو اس بات کی دہائی دیتے ہیں کہ جس راستہ پر وہ گامزن ہے وہ فوز و فلاح کا راستہ نہیں بلکہ تباہی اور بربادی کا راستہ ہے اور یہ اس کی علامتیں اور نشانات ہیں جنہیں دیکھ کر اسے عبرت پکڑنی چاہیے ورنہ وہ ایسے خوفناک انجام سے دوچار ہوگی کہ دوسری قوموں کے لیے باعث عبرت بنے گی۔ اللہ کا یہ قانون ہے کہ جب بھی کائنات کے کسی حصّے میں توازن بگڑنے لگتا ہے تو وہ خود ہی اس کی درستی کا انتظام فرما دیتا ہے۔ حیاتِ انسانی میں بھی اس کا یہی اُصول کار فرما ہے لیکن یہاں وہ اس بگاڑ کے خوفناک نتائج کو سامنے لاکر

انسانوں کو اس بات کا مکلف ٹھیرانا ہے کہ وہ خود اس کی درستی کی فکر کریں اور اگر وہ ایسا کر لیں تو انہیں آبرومند قوم کی حیثیت سے زندہ رکھنا ہے ورنہ گلے سڑے پھلوں کی طرح انہیں غلاظت کے اُن ڈھیروں پر پھینک دیتا ہے جہاں گزری ہوئی گمراہ قوموں کے بوسیدہ پنجر تعفّن پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔

مغربی تہذیب نے انسانی معاشرے کے فطری توازن کو جس بیدردی کے ساتھ درہم برہم کیا ہے اس کے تلخ نتائج اب اپنی ساری قہرمانیوں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آرہے ہیں اور ان کی تلخی کا احساس ان لوگوں کو بھی ہو رہا ہے جو اس مادی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ اس تہذیب نے فرد کی آزادی اور جمہوریت کے نام پر انسانوں کو من مانی کارروائیاں کرنے کی اجازت دی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو معیشت میں محنت کشوں کا استحصال شروع ہوا اور پھر جب حالات نے خوفناک صورت اختیار کر لی تو مزدوروں کی حکمرانی کے نام پر انسانوں کو اشتراکیت کی جکڑ بندیوں میں جکڑ دیا گیا۔ اسی طرح سیاست میں زبردست آزادی بالادستوں کا شیوہ بن گئی۔ معاشرت میں بھی عائلی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگیں اور رشتۂ مناکحت کے احترام کے بجائے آزاد شہوت رانی لوگوں کا دلپسند مشغلہ بن گیا۔ گو مغربی تہذیب کے بطن سے نمودار ہونے والی یہ بُرائیاں آغاز میں اس قدر بھیانک دکھائی نہ دیتی تھیں جتنی کہ اب نظر آرہی ہیں مگر اصحاب بصیرت کو شروع ہی میں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ یہ تہذیب جن غیر متوازن عناصر سے عبارت ہے وہ لازمی طور پر اس کی بربادی کا سامان بھی فراہم کریں گے اور مادیّت کی جس شاخ نازک پر اس نے اپنا آشیانہ بنا رکھا ہے وہ ٹوٹ کر اس آشیانے کو اس انداز سے پیوند خاک کرے گا کہ آنے والی نسلیں اس کی المناک تباہی پر خون کے آنسو بہائیں گی۔

ISLAMIC RESEARCH ACADEMY SERIES

main springs of western civilisation

ABDUL HAMEED SIDDIQUI

ISLAMIC BOOK CENTRE
POST BOX 1625, LAHORE. PAKISTAN